انتخاب مضامین

احمد جمال پاشا

مرتبہ

عابد سہیل

اُتر پردیش اُردو اکادمی

www.taemeernews.com

سلسلۂ مطبوعات : ۲۵۶

انتخاب مضامین

احمد جمال پاشا

مرتبہ

عابد سہیل

اترپردیش اردو اکادمی
لکھنؤ

www.taemeernews.com

© اتر پردیش اردو اکادمی

انتخاب مضامین احمد جمال پاشا

مرتبہ عابد سہیل

پہلا ایڈیشن ۲۸ فروری ۱۹۸۸
تعداد ۱۰۰۰
قیمت سات روپے

رام کرشن ورما، سکریٹری اتر پردیش اردو اکادمی نے آفسیٹ پریس گورکھپور سے چھپوا کر بلہرہ ہاؤس، قیصر باغ لکھنؤ سے شائع کیا۔

www.taemeernews.com

پیش لفظ

احمد جمال پاشا کا شمار ان ادیبوں میں ہوتا ہے جنھیں عمر تو مختصر ملی لیکن انھوں نے تخلیق کی ادب عالیہ کی۔ بعض تنقید نگاروں کا یہ موقف رہا ہے کہ مزاحیہ ادب کبھی ادب عالیہ کے زمرے میں شامل نہیں ہوسکتا مگر اردو کے بعض مزاح نگاروں نے جن میں احمد جمال پاشا بھی ہیں، اس موقف کا بطلان کیا ہے۔

احمد جمال پاشا کا مشاہدہ جتنا قوی اور تیز تھا، اس سے کہیں زیادہ قوی اور تیز ان کی وہ صلاحیتیں تھیں جو مشاہدے کو طنز و مزاح میں بدل دیتی ہیں۔ پاشا کا مزاح صرف ادب تک محدود نہیں ہے۔ وہ کبھی کبھی اسے علم کے درجے تک پہنچا دیتے ہیں اور ان کا کمالِ فن یہ ہے کہ علم اور مزاح دونوں کا احترام ملحوظ رکھتے ہیں۔

مرحوم کے مضامین کا کوئی انتخاب ابھی تک شائع نہیں ہوا تھا۔ اکادمی کی درخواست پر مشہور ادیب جناب عابد سہیل نے ان کا جامع انتخاب مرتب کیا اور اس پر ایک وقیع مقدمہ لکھا۔ اکادمی عابد سہیل صاحب کا شکریہ ادا کرتی ہے۔

امید ہے کہ اکادمی کی دوسری مطبوعات کی طرح انتخابِ مضامینِ احمد جمال پاشا کو بھی حسنِ قبول ملے گا۔

محمود الٰہی
چیرمین، مجلسِ انتظامیہ

اترپردیش اردو اکادمی
قیصر باغ، لکھنؤ
۱۲ر فروری ۸۶ء

www.taemeernews.com

ترتیب

مقدمہ	۷
۱۔ ادب میں مارشل لا	۱۹
۲۔ شکر کا چکر	۳۳
۳۔ ستم ایجاد کرکٹ اور میں بے چارہ	۴۰
۴۔ غدر ۱۹۵۷ کے اسباب	۴۷
۵۔ کپور ۔ ایک تحقیقی و تنقیدی مطالعہ	۶۱
۶۔ کتے کا خط پطرس کے نام	۷۰
۷۔ شرافت کی تلاش میں	۷۶
۸۔ میزبان بے زبان	۸۳
۹۔ فنِ لطیفہ گوئی	۹۰
۱۰۔ علیم صاحب	۱۰۶

www.taemeernews.com

احمد جمال پاشا

۱۹۳۶—۱۹۸۷

www.taemeernews.com

مقدمہ

احمد جمال پاشا اور مزاح ایک دوسرے کے لیے بنے تھے۔ ان کی تحریر و تقریر میں مزاح کی وہی حیثیت ہے جو غالب کے ہاں "بادہ و ساغر" کی تھی، تحریر میں کم اور تقریر میں زیادہ کیوں کہ ان کی تخلیقات میں دھیرے دھیرے طنزیہ عنصر کی آمیزش کا اضافہ ہو رہا تھا۔

جمال پاشا نے اپنے ادبی سفر کا آغاز بطور مزاح نگار کیا۔ ان کے ابتدائی مزاحیہ مضامین تبسم زیرِ لب سے زیادہ خندہ دنداں نما کا سبب بنتے تھے۔ ان مضامین میں انھوں نے زبان کی اٹھکھیلیوں، رعایت لفظی اور ہم قافیہ بلکہ ہم صوت الفاظ سے مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ دوسرے دور میں مضحک صورت حال اور واقعات بھی ہم رکاب ہو گئے ہیں اور اسی مناسبت سے زبان کی اٹھکھیلیوں کی کمی بھی متوجہ کرتی ہے۔ لیکن جلد ہی انھوں نے محسوس کر لیا کہ محض مضحک واقعات اور الفاظ کی بازی گری سے کوئی بڑا کارنامہ انجام نہیں دیا جا سکتا اور انھوں نے اپنی فکر اور قلم کا رخ طنز نگاری کی طرف موڑ دیا جس کے چند بہت عمدہ نمونے ان کے آخری مجموعہ مضامین "پتیوں پر چھڑکاؤ" میں ملتے ہیں۔ ان مضامین کے رنگ چوکھے ہیں اور یہ طرز اظہار امکانات کی وسیع دنیا لیے ہوئے ہے لیکن اسے پوری طرح بروے کار لانے کی زندگی نے انھیں مہلت نہ دی۔ جمال زندگی کی اس منزل میں تھے۔ جہاں تجربات، فنی ریاض اور علم کی آمیزش کے سبب شاہکاروں کی تخلیق متوقع تھی لیکن افسوس

یہ نہ ہو سکا۔ ان کا آخری طنز بے حد کاری تھا، اس قدر کاری کہ اس نے تبسم کے سارے در بند کر دیے اور وہ ۲۸ ستمبر ۱۹۸۷ء کو اس طرح خاموشی سے رخصت ہو گئے گویا کہہ رہے ہوں "میاں اب تم جانو اور تمھاری دنیا۔ ہم تو چلے"۔

احمد جمال پاشا (اسناد کے مطابق) یکم جون ۱۹۳۶ء کو الہ آباد میں پیدا ہوئے جہاں ان کے والد جج تھے، جو ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد ان کے والد ۱۹۴۰ میں لکھنؤ منتقل ہو گئے۔ جہاں، اسے حسن اتفاق ہی کہیے، کہ جمال پاشا کو امین آباد کے اس مکان کو اپنی مستقل رہائش گاہ بنانے کا موقع ملا جس میں کبھی مجاز مقیم رہ چکے تھے۔ ان دنوں یہ مکان سروری منزل کے بجائے "حکیم پتی کا گھر" کہلاتا تھا۔ کچا حاطہ نامی محلہ جس میں سروری منزل واقع ہے جوش ملیح آبادی کے دادا فقیر محمد خاں گویا نے آباد کیا تھا۔ اسی محلہ میں صفی لکھنوی، ناطق لکھنوی، مولانا عبدالباری آسی اور شوکت تھانوی بھی رہ چکے تھے۔ اس طرح پانچ سال کی عمر سے کم و بیش ۲۵ سال یعنی ۱۹۷۵ء تک جب وہ سیوان (بہار) منتقل ہوئے، انھوں نے ایک ایسے علاقے میں اپنے شب و روز گزارے جس میں علم و ادب، طنز و مزاح، شاعری، حاضر جوابی اور شگفتگی کا ایک طویل عرصہ سے دور دورہ تھا۔ اس پر مستزاد ان کا شوقِ مطالعہ اور ذاتی اپج۔ چنانچہ طنز و مزاح، دوست داری اور دل جوئی کا وہ آمیزہ تیار ہوا جس کا دوسرا نام احمد جمال پاشا تھا۔

جمال نے ابتدائی تعلیم اسلامیہ کالج اور کوئنس کالج میں حاصل کی جس کے بعد کرسچین کالج ہوتے ہوئے وہ لکھنؤ یونی ورسٹی پہنچے اور شعبۂ کامرس میں داخلہ لے لیا۔ لیکن یہ بیل کسی طرح منڈھے نہ چڑھی تو انھوں نے بی۔ اے کیا اور اردو میں ایم اے کرنے کے بعد علی گڑھ یونی ورسٹی چلے گئے۔

مزاح نگاری انھوں نے لکھنؤ ہی میں شروع کر دی تھی اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے ایک جلسہ میں جو حسب معمول سرور صاحب کی قیام گاہ نعمت اللہ بلڈنگ میں ہوا تھا انھوں نے اپنا ایک مزاحیہ سنا کر محفل کو قہقہہ زار بنا دیا

www.taemeernews.com

تھا۔ اس مزاحیہ مضمون کا یہ جملہ کہ "مجھے نہیں یاد کہ میں نے سگریٹ پہلے پینا شروع کی یا ہوش پہلے سنبھالا لیکن جب ہوش سنبھالا تو سگریٹ پی رہا تھا" ایک عرصہ تک شہر کی ادبی فضا میں گونجتا رہا۔ ان کی مزاح نگاری کے جوہر علی گڑھ میں کھلے جہاں قیام کے دوران انھوں نے اسکالر کا پیروڈی نمبر ایڈٹ کیا۔ اسی دوران نقوش میں ان کے مضمون "ادب میں مارشل لا" کی اشاعت نے انھیں ملک گیر شہرت کا مالک بنا دیا۔

علی گڑھ یونی ورسٹی سے ایم۔ اے کرنے کے بعد لکھنؤ واپس آکر انھوں نے ماہنامہ اودھ پنچ" جاری کیا۔ یہ "اودھ پنچ" کی تیسری زندگی تھی لیکن یہ مہلتِ حیات بہت مختصر ثابت ہوئی اور جمال کچھ ہی دنوں بعد قومی آواز کے شعبۂ ادارت سے منسلک ہو گئے۔ یہ تعلق کم و بیش پندرہ سال یعنی اس وقت تک قائم رہا جب ۱۹۷۵ء میں وہ بہار یونی ورسٹی کے اسلامیہ کالج، سیوان سے متعلق ہو کر مستقل طور پر وہاں منتقل ہو گئے۔ سیوان ان کی اہلیہ، سرور جمال صاحبہ کا مائکہ بھی ہے اس لیے ان کے مداح اور دوست ان سے محرومی کے بوجھ کو کم کرنے کے لیے مزاح کے طور پر اسے سسرال کے لیے ان کی رخصتی کے عنوان سے بھی یاد کرتے تھے۔ سیوان میں انھوں نے اپنی وسیع و عریض قیام گاہ میں "پاشا اورینٹیل ریسرچ سینٹر" قائم کیا جس میں ۱۲ سال کی مختصر مدت میں انھوں نے ہزاروں کتابیں جمع کر لیں جن میں طنز و مزاح سے متعلق کتابوں، مسودات اور نادر مخطوطات کی تعداد فطری طور پر بہت زیادہ ہے۔ اس موضوع پر یہ سینٹر برصغیر کا شاید سب سے بڑا کتب خانہ ہے جس سے استفادہ کے لیے ملک اور بیرونِ ملک تک سے طلبہ سیوان آتے رہتے تھے۔

جمال پاشا کے جدِ امجد بنگال سے ہجرت کر کے سب سے پہلے عظیم آباد (پٹنہ) ہی آئے تھے۔ جہاں ایک طویل عرصہ تک قیام کے بعد یہ خاندان گورکھپور اور الہ آباد ہوتا ہوا لکھنؤ آن بسا۔ اس طرح بنگال سے اوّلین

www.taemeernews.com

ہجرت سے اگر صرفِ نظر کیا جائے تو جمال کی اس نقل مکانی کو دائرہ کی تکمیل اور اپنی مٹی کو سینہ سے لگائے رکھنے کی خواہش کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔

سیوان منتقل ہونے کے باوجود انھوں نے لکھنؤ سے اپنا تعلق قائم رکھا تھا۔ سال میں دو تین بار وہ ضرور لکھنؤ آتے اور ان کے قیام کے دوران یہ احساس بھی نہ ہوتا کہ وہ چند دنوں بعد سیوان لوٹ جائیں گے۔ ان کے قیام کے درمیان محفلیں جمتیں، قہقہوں کے فوارے چھوٹتے، ادبی مسائل پر بحثیں ہوتیں وہ اپنے ایک ایک دوست سے ملاقات کرتے، کتابیں خریدتے اور یہ خیال بھی نہ آتا کہ وہ اس شہر کو خیرباد کہہ چکے ہیں۔

احمد جمال پاشا سے میری آخری ملاقات غالباً ۱۶ یا ۱۷ جون کو ہوئی تھی۔ خلافِ معمول صرف گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد جب انھوں نے کہا "اب چلتے ہیں" تو میں نے کندھے پر ہاتھ رکھ کر انھیں دوبارہ کرسی پر بٹھا دیا۔ پندرہ بیس منٹ وہ کچھ اکھڑی اکھڑی سی باتیں کرتے رہے جس میں نہ مزاح تھا، نہ بذلہ سنجی، نہ جملہ بازی، نہ چہرہ پر وہ باغ و بہار کیفیت تھی جو ان کا خاصہ تھا۔ پھر ایک دم اٹھ کھڑے ہوئے "اب چل چلاؤ ہے" انھوں نے کہا اور میں سناٹے میں آگیا۔ میں نے زوردار قہقہہ لگایا اور اس جملہ کو مذاق میں اڑانے کی کوشش کی اور اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے ان کے ساتھ سڑک تک آیا۔ جہاں ہم دونوں خاصی تیز دھوپ میں کھڑے کھڑے پندرہ بیس منٹ تک باتیں کرتے رہے۔

جمال پاشا اور سنجیدگی دو متضاد چیزوں کے نام تھے۔ لیکن اس بار، آخری ملاقات میں، وہ اس قدر سنجیدہ تھے یہ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ ۲۹ ستمبر ۱۹۸۷ء کو ان کے انتقال کی خبر نے شہر کے ادبی حلقوں کو غم و اندوہ کی دبیز چادر اُڑھا دی اور چند ہی دن بعد اردو اکاڈمی کے ہال میں ایک ایسا تعزیتی جلسہ ہوا جس میں بیشتر مقررین نے انھیں اپنی تقریروں کے بجائے آنسوؤں سے خراجِ عقیدت پیش کیا۔ ایسا تعزیتی جلسہ شہر میں نہ کبھی ہوا اور نہ شاید ہی

www.taemeernews.com

کبھی ہو۔

کم و بیش پچیس کتابوں کے مصنف احمد جمال پاشا نے نثری مزاح نگاری کی ہر صنف کو برتا اور ہر جگہ اپنا نقش ثبت کیا۔ مزاحیہ اور طنزیہ مضامین کے علاوہ پیروڈی اور خاکہ نگاری میں بھی انھوں نے اپنے جوہر دکھائے۔ پیروڈی ایک مشکل فن ہے کیوں کہ اس میں جس مصنف کی پیروڈی مقصود ہو اس کے اسلوب اور طریقِ فکر سے مکمل واقفیت کے بغیر کامیابی ممکن نہیں۔ ان کی پیروڈیاں ایسی ہیں کہ ان کے دو جملوں کا مطالعہ ہی نشانہ کی سمت کا تعین کر دیتا ہے۔ اس صنفِ مزاح میں ان کا کوئی حریف نہیں۔ ان کے دوسرے مضامین میں اس طرزِ مزاح کے اثرات جہاں جہاں ملتے ہیں ان کا فن اور بھی آب دار ہو جاتا ہے۔ جمال کا فکری سفر مزاح سے طنز کی جانب تھا لیکن انھوں نے شروع ہی میں جن اوزاروں کا انتخاب کیا تھا، یعنی رعایت لفظی اور ہم صوت الفاظ سے مزاح پیدا کرنے کی کوشش، ان سے وہ طنز میں بھی کام لیتے رہے جس کی وجہ سے ان کے طنزیہ مضامین میں وہ خشکی اور واعظِ تنگ نظر کی وہ تندی اور سخت گیری نہ پیدا ہوئی جس کا شکار اکثر طنز نگاری ہو جاتی ہے۔ انھوں نے اپنے سفر کے وسط میں واقعہ سے مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی لیکن انھیں جلد ہی احساس ہو گیا کہ اس کے ڈانڈے بہ آسانی پھکڑ پن سے مل جاتے ہیں اور لطافت کا وہ جوہر مفقود ہو جاتا ہے جو مزاح کو تبسمِ زیرِ لب اور طنز کو خوبصورت فریم میں جڑا ہوا آئینہ بناتا ہے۔ چنانچہ بعد میں انھوں نے اس سے کم کم ہی کام لیا۔

جمال پاشا کی ادبی فتوحات کا جائزہ لینے کے لیے ایک دفتر درکار ہو گا، اس لیے ان کے چند ایسے جملوں اور فقروں پر اکتفا کرنا مناسب ہو گا جو مزاحیہ ادب میں ان کی اور اپنی بقا کے ضامن ہیں۔

www.taemeernews.com

"ساری دین و دنیا اُن کے کلام تک محدود ہوتی ہے لیکن ان کا کلام
لا محدود ہوتا ہے۔" (مجھ سے ایک چائے کی پیالی نے کہا)

"مردانہ حسن میں مونچھوں کی وہی اہمیت ہے جو محبوب ستم پیشہ کے لیے
زلف بنگالہ کی ....اور ایسی مونچھیں تو بالکل نہیں پسند کی جاتیں جن کا
زیادہ تر قیام وطعام منھ کے اندر رہتا ہے۔" (مونچھیں)

"رستم یہ ممتحن کون ہے جو ہم کو فیل کرے گا؟"
نجومی نے زمین بوس ہو کر کہا
"حضور میرے منھ میں خاک آپ محض نقل کرتے ہوئے پکڑے
جائیں گے اور آپ کی کاپی پر نشان بنا دیا جائے گا۔" (رستم امتحان کے میدان میں)

"ان کا دن رات کا یہ کام ہے کہ دنیا بھر میں جو چیز بھی ہو اس میں ڈھونڈ
ڈھونڈھ کر برائی نکالیں گے۔ اگر مسکرانا چاہیں گے تو ہفتوں مسکرانے کے
لیے زمین تیار کریں گے اور آخر میں ناکام رہیں گے۔" (یونی ورسٹی کے لڑکے)

www.taemeernews.com

کردار راشن کی دکان سے شکر لینے جا رہا ہے۔

"کپڑا لے کر میں شکر لانے کے لیے چلا تو والدہ نے پکارا

"ٹھہرو! امام ضامن تو بندھوا لو"

بھابھی بولیں

"ہاں اور نہیں تو کیا، دن کا کھانا بھی کھا لو اور رات کا ساتھ لیتے جاؤ"

دادی ماں نے پکار کر والدہ سے کہا

"ارے بہو اس غریب کا دودھ تو بخش دو"

بھائی صاحب بولے

"دیکھو ساتھ میں بستر بھی لیتے جاؤ اور کچھ روپے بھی رکھ لو، نہ جانے کیا ضرورت پڑ جائے؟"

بڑی بہن نے بلائیں لیتے ہوئے اپنا فرسٹ ایڈ کا بکس دیتے ہوئے کہا

"احتیاطاً اسے بھی ساتھ لیتے جاؤ"

دولہا بھائی آنکھوں میں آنسو لاتے ہوئے بولے

"شکر لینے جا رہے ہو تو ہم لوگوں کا کہا سنا بھی معاف کرتے جاؤ"

بیگم نے آب دیدہ ہو کر دوپٹہ سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا

"مجھے کس پر چھوڑے جا رہے ہیں؟" (شکر کا چکر)

www.taemeernews.com

"مجھے یہ کہنا ہے کہ کپور کے مضامین میں جو وہ لکھتے ہیں وہ مضامین اور ان دوسرے مضامین میں جو طنزیہ و مزاحیہ ہوتے ہیں، ان مضامین میں میرے خیال میں جہاں تک میں نے ان کا تنقیدی تجزیہ کیا ہے اور میں جن نتائج پر بالترتیب پہنچا ہوں کہ یہ مضامین اپنی جگہ پر ایسے مضامین ہیں جن میں میری دانست میں طنز ہے یعنی ان مضامین میں طنز ہے"۔ (کپور۔ ایک تحقیقی و تنقیدی مطالعہ)

"چھوٹے قد کے آدمی کے ساتھ صرف یہی مصیبت نہیں، بلکہ اس غریب کی بات بھی کوئی نہیں سنتا، لوگ اس کی ہر بات یہ کہہ کر رد کر دیتے ہیں کہ 'بری بات، بڑوں کے بیچ میں نہیں بولتے'۔" (چھوٹا قد)

"افوہ! حکومت نے بھی کیسے کیسے لوگ رکھ چھوڑے ہیں جو اسکور تک نہیں بتا سکتے۔ بھلا یہ حکومت چل سکتی ہے؟" (ستم ایجاد کرکٹ اور میں بے چارہ)

---

www.taemeernews.com

اقبال صاحب سیمناروں کے سلسلے میں خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ہمیں جن
اقبالی موضوعات پر دعوتِ فکر دی جا چکی ہے ان میں سے کچھ ملاحظہ ہوں
"علامہ اقبال کی پسندیدہ ترکاریاں ــ کیا اقبال ویجی ٹیرین تھے؟۔
علامہ اقبال اپنے حقہ کا خمیرہ کہاں سے منگواتے تھے ..... اقبال اور چوپائے۔
اقبال کی پسندیدہ چڑیاں ــ کلام اقبال میں کنجشک کے مقام کا تعین ــ اقبال
کا شہباز اب کہاں ملتا ہے ــ کلام اقبال میں لفظ خودی کے اعداد و شمار اور
فی صد تناسب .....
لیکن کچھ موضوع ایسے تھے جو گہرے غور و فکر کی دعوت دیتے مثلاً
"علامہ اقبال کی فہم رسا میں مستقبل کی آزاد ایشیائی مملکتوں کے حدود اربعہ۔
ــ کلام اقبال کا صوتی آہنگ کوزی، تجسوتیوں اور غنائی آوازوں کے زیر و
بم میں ــ فلسفہ مابعد الطبیعات میں عربی و رومی کی رجعت قہقری اور علامہ اقبال
کے فلسفۂ بے خودی کا آہنگ بلند مقام ــ قرون وسطیٰ میں ملت بیضا کے درخشاں
ماضی کے شوکت پاستاں کی روشنی میں حکیم الامت کا استحکام ملت جمہوریت کے آئینے
میں معراج انسانیت"۔ (اقبال کی تلاش میں)

---

www.taemeernews.com

"وہ اگر قوت الاسلام کے بارے میں یہ بھی فرما دیتے کہ اس کی تعمیر قوتِ بازو سے کی گئی ہے تو یار ہم مان بھی جاتے کہ اس میں کچھ نہیں تو کم از کم مزدور کے پسینے کا ذکر خیر آ گیا اور اس میں ترقی پسندی کا ایک پہلو نکل آیا۔ قصہ یوں ہے کہ پرانے زمانے میں ہر ناعاقبت اندیش فاتح بلا مسٹر ادک کی تاریخ دانی کی پروا کیے، فتح ہونے والے قلعے میں عبادت گاہ بنوا دیتا تھا۔ آج بھی فاتح یہی کرتا ہے۔ لیکن حیرت یہ ہے کہ اس باب میں تاریخ میں صرف مسجد کی تعمیر کا ذکر ملتا ہے۔ اس کے آگے تاریخ خاموش ہے۔"

(اوکیات)

www.taemeernews.com

احمد جمال پاشا آج ہم میں نہیں لیکن ان کی یاد وہ متاع عزیز ہے جسے ہر وہ شخص جو ان سے مل چکا ہے ہمیشہ اپنے سینے سے لگائے رکھے گا۔ ایسا بے ریا، صاف دل، ہنسوڑ، روتوں کو ہنسانے والا ان کے دکھ درد بانٹنے والا اور احسان کر کے شرمندہ ہونے والا یار شاطر اور یار طرح دار اب پیدا ہونے سے رہا۔

ایسا کہاں سے لائیں کہ تجھ سا کہیں جسے

عابد سہیل

www.taemeernews.com

مضامین احمد جمال پاشا

www.taemeernews.com

ادب میں مارشل لا

حالات اب صدر اردو کے قابو سے باہر ہو چکے تھے۔ علمی، ادبی سرگرمیوں اور تحریکوں نے ادبی مزاج کی صورت اختیار کر لی تھی، ملکِ ادب خوف ناک اور گندی سیاست میں مبتلا تھا۔ ادب، صحافت اور پمفلٹ میں تمیز کرنا بدتمیزی تصور کی جانے لگی تھی، اور ہنگاموں کا باعث ہوا کرتی تھی، دائمی قدروں کو وقتی قدروں میں تبدیل کرنے والے اب اسے لمحاتی قدروں میں تبدیل کرنے پر تُلے ہوئے تھے۔ مجبوراً صدر نے ملکِ ادب پر مارشل لا نافذ کر دیا۔ ادب کا نظم و نسق براہ راست ادبی فوج کے ہاتھ میں آگیا اور جب اہلِ ادب کی آنکھ کھلی تو وہ حیران رہ گئے کیوں کہ جمہوریت میں چڑیا اڑ چکی تھی اور کی طوطی بول رہی تھی۔

بریگیڈیر گلدار نے منتظم اعلیٰ مارشل لا کی حیثیت سے انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ انھوں نے ادبی قوم کے نام ایک مخصوص نشریے میں کہا:

"ہمارے پاس ادبی تنقید کا کوئی جمہوری طریقہ نہیں۔ فی زمانہ ادب میں خواجہ سرائیاں عام ہیں۔ سرقہ، توارد اور آورد سے شعراء نے ادب کے ناک میں دم کر رکھا ہے، موجودہ ادیب ادب کے نام پر ٹریش لکھ رہے ہیں۔ ادب اس وقت پیسے کمانے نعرے بازی، گروپ بندی اور پگڑی اچھالنے کا اکھاڑہ بنا ہوا ہے، ادب کی محترم ہستیاں بے ادبی کرنے تک سے نہیں چوک رہی ہیں۔ ہم کو اقتدار اپنے

www.taemeernews.com

ہاتھ میں لے کر ادب کی رفتار سنبھالنی ہے، ہم اس وقت تک چین سے
نہیں بیٹھیں گے جب تک کہ موجودہ ادب کو دنیا کے صالح ترین ادب کے
مقابلہ نہ کھڑا کر دیں۔"

اعلانات کے مطابق دھمکی دی گئی کہ اگر کسی ادیب یا پبلشر نے دوکان بند کی تو اس کے خلاف فوجی عدالت میں مقدمہ چلایا جائے گا اور کاروبار ادب کو حسبِ معمول چلانے پر زور دیا گیا۔

اس فوجی عدالت کے روح رواں بریگیڈیر گلدار نے لیفٹیننٹ کرنل غیض، کرنل مشفق الرحمٰن، کیپٹن صفیر جعفری، ملکِ ادب کے ممتاز ترین جاسوس کرنل آفریدی کی خدمات حاصل کرلیں۔ سارا پلان نہایت احتیاط سے تیار کیا گیا۔ رات کے بارہ بجے انقلاب عمل میں آیا۔ ادبی مرکز اور صدر کی رہائش گاہ فوج کی حفاظت میں ہیں۔ بڑے بڑے شاعر، ادیب اور نقاد اپنے اپنے گھروں میں نظر بند کر دیے گئے ہیں۔

ابھی تک کسی شورش کی خبر نہیں آئی، پورے ملک میں امن وامان رہا۔

ادب میں انقلاب کے اسباب وہ حالات ہیں جو اور زیادہ خراب نہیں ہو سکتے تھے۔ بلکہ اس خرابی سے خون خرابے کے لیے کام لیے جا رہے تھے۔ گو کہ طوائفوں نے لکھنؤ اسکول کے (خاتمہ) کے بعد سے ایک حد تک اردو ادب کا ساتھ چھوڑ دیا تھا مگر پھر بھی موجودہ دور مکمل طور پر طوائف الملوکی میں مبتلا تھا۔ سارا ادب ایک گمنام دیوان کے نامکمل مقدمہ کے گرد بلا کسی "تھیوری" کے گھوم رہا ہے الٹی سیدھی تعبیریں پیش کرنے والے ناقدین کی بستیاں اپنی برادری تک محدود رہتیں اور برادری کے باہر جانے والے کا حقہ پانی بند کر دیتیں۔ شخصی تاثرات کے عمل اور ردِ عمل نے ادب کو گورکھ دھندا بنا دیا تھا۔ امرا، حکام، رشتہ دار، احباب اور خدمت گزار ہی تعریف کے دائرے میں آتے تھے۔ ادب کے ذمہ دار وہ لوگ نہیں تھے جو تاج محل

www.taemeernews.com

بنانا جانتے ہوں، بلکہ وہ تھے جو تاج محل کھودنے کے فن سے واقف ہوں۔ عموماً جس کے بارے میں کسی نے کوئی فتویٰ صادر کر دیا تھا، بقیہ سب اسی کو دہرا دیتے۔ ادبی سرقے، سرقہ بالجبر کی صورت اختیار کر چکے تھے۔ ادب، صحافت اور صحافت کے درمیان حدِ فاصل کھینچنا مشکل تھا۔ نئے نام لیتے ہوئے سب بے حد ڈرتے اور گھبراتے۔ اچھا ادب وہ سمجھا جانے لگا جو زیادہ بکے، زیادہ تر ادیب سرِ شام ہی کروڑوں کی تعداد میں آبادی سے دور نکل جاتے جہاں سے وہ سنسنی خیز ڈاکو، جنگلی درندے، بدروحیں، بھوت پریت، ٹارزن، ڈریکولا اور کنگ کانگ جیسے عجوبے اٹھا لاتے۔ بیشتر ادب اسی قسم کے داغ دھبوں سے چیچک زدہ ہو رہا تھا جس کی صفائی اب فوج کی نگرانی میں ہو رہی ہے۔

نقادوں کی مسلسل کوششوں کے نتیجہ میں لوگوں نے قدیم اور جدید ادب کے مطالعے کے بجائے تنقیدیں پڑھنا شروع کر دی تھیں۔ اصل کتاب پڑھنے کا فیشن اب تقریباً آوٹ آف ڈیٹ ہو چکا تھا۔ نقادوں کے مسلسل اصرار پر بہت سے اچھے افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں نے افسانے اور ناول لکھنے سے توبہ کر لی تھی۔ لوگوں نے بھی بہترین ناول و افسانے پڑھنے کے بجائے بدترین تنقیدیں پڑھنا شروع کر دی تھیں۔ مگر خود تنقید میں پتہ لگانا مشکل تھا کہ کس کا کون رنگ ہے، یا موجودہ رنگ کہاں سے اڑایا گیا ہے۔ اگر مقالہ نگاروں کے نام اڑا دیے جائیں تو وہ سب کسی ایک ہی نومشق طالب علم کی تحریریں معلوم ہوتیں۔ ایک ہی بات کو بار بار کہنے کا مرض عام ہو گیا تھا۔ اس استادانہ پینترے بازی میں ایک ممتاز نقاد نے تو کمال ہی کر دیا۔ ان حضرت نے کسی زمانہ میں مومنؔ پر ایک مقالہ لکھا جس کی بڑی واہ واہ ہوئی۔ کچھ عرصے بعد انھوں نے اسی مقالے کو پھر نئے عنوان سے شائع کرا دیا اور پھر واہ واہ مچ گئی۔ فوجی حکام نے جب ان کے گھر پر چھاپا مارا تو ان کی کل کائنات ادب یعنی مومنؔ پر مقالہ برآمد کر لیا گیا۔ فوجی حکومت کے ایک اعلانیہ کے مطابق پہلے اس

مقالہ کا عنوان صرف "حکیم مومن خاں مومنؔ" تھا جس کو انھوں نے حسب ذیل عنوانات سے متعدد بار چھپوایا:

"حکیم مومن خاں مومنؔ"۔ "مومن خاں مومنؔ"۔ "مومنؔ کی شاعری"۔ "مومنؔ کی غزل گوئی"۔ "مومنؔ شاعری کے آئینے میں"۔ "مومنؔ بحیثیت شاعر"۔ "مومنؔ اور ان کی شاعری"۔ "مومنؔ کی شاعری کا نفسیاتی تجزیہ"۔ "مومنؔ ایک مطالعہ"۔ "مومنؔ میری نظر میں"۔ "مومنؔ اردو شاعری کی نظر میں"۔ "اردو شاعری کی نظر مومنؔ پر"۔ "مطالعۂ مومنؔ"۔ "مومنؔ کی شخصیت اور شاعری"۔ "مومنؔ اور تصوّف"۔ "مومنؔ کا محبوب"۔ "مومنؔ کا لب و لہجہ"۔ "مومنؔ اور ہم"۔ "مومنؔ اور میں"۔ "مومنؔ ــــ ایک سوال"۔ "کیا مومنؔ شاعر تھے؟"

قبلہ کا ارادہ اب اس پر مقدمہ لکھوا کر مجموعہ شائع کروانے کا تھا۔ مگر فوج نے اس پر قبضہ کر لیا۔ ان کو فریب دہی کے الزام میں جیل بھیج دیا گیا اور وارننگ دے دی گئی کہ آئندہ کبھی مومنؔ پر کچھ نہ لکھیں خیال ہے کہ جیل میں ان کو سزا کے طور پر مومنؔ کا باقاعدہ مطالعہ کرنے کی قید بامشقت دی جائے گی۔ ایک دوسرے بزرگوار کا کورٹ مارشل کرنل آفریدی کی عدالت میں کیا گیا۔ کیپٹن وحید کی اطلاعات کے مطابق وہ بہت سے تنقیدی مقالات اور کتب سامنے رکھ کر غالبؔ کے اوپر ایک مقالہ منتقل کرتے ہوئے پکڑے گئے۔ ان پر غالبؔ کی توہین کرنے کے سلسلے میں مقدمہ چلایا گیا۔ عدالت نے انھیں عبور دریائے ادب کی سزا دی۔ ایک ممتاز نقاد کے گھر سے بیشتر ایسی کتابیں نکلیں جن پر ان کی تنقیدیں اور تبصرے شائع ہو کر ملک میں خاصے مقبول ہو چکے تھے مگر ان تبصرہ شدہ کتابوں کے ورق تک نہ کٹے تھے۔ تازہ ترین اطلاعات کے مطابق ان کو ان کے آبائی کتب خانے میں قید کر دیا گیا ہے اور ان کو

www.taemeernews.com

ان تمام کتابوں کے ورق کاٹنے کی سزا دی گئی ہے۔ اطلاع میں ہے کہ جب تک ساری کتابوں کے ورق نہ کٹ جائیں ان کو ان پر مزید تبصرہ کرنے کا لائسنس نہیں ملے گا۔

شام کی خبروں میں گرفتار ہونے والوں کی جو فہرست سنائی گئی اس میں اچھی خاصی تعداد ان بزرگوں کی ہے جنھوں نے ادب کے منصب اپنے دوستوں، رشتہ داروں اور ہم وطنوں میں تقسیم کرکے حق داروں کو ان کے حق سے محروم کر دیا تھا۔ یہ سب اب فوجی حراست میں ہیں۔ ان کی ضمانتیں نامنظور کر دی گئی ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ اپنی تحریروں کی تردید شائع کرنے پر ان کی سزاؤں میں تخفیف کر دی جائے۔ مگر ان لوگوں کی سزاؤں میں کمی نہیں کی جائے گی جنھوں نے خود لکھ لکھ کر اپنے خاندان کے لوگوں کو شاعر و ادیب بنانے کی وقتی کوششیں کی تھیں۔ ان میں ایسے لوگ بھی تھے جو موقع ملنے پر حملہ کرنے سے کبھی نہیں چوکتے تھے اور ہمیشہ گمنام ناموں سے دوسروں پر مضامین اور تخریبی خطوط لکھ لکھ کر رسائل کے ذریعے کیچڑ اچھالا کرتے تھے۔ ان لوگوں کے لیے فوج نے نہایت کلاسیکل قسم کی سزا مقرر کی ہے۔ ایسے تمام لوگوں کو گدھے پر سوار کرکے مع ان کے اصل نام کے سائن بورڈ کے روزانہ صبح و شام ہوا خوری کے لیے بھیجا جائے گا اور عبرت ہونے پر ان کو اصل نام سے لکھنے کی اجازت دی جائے گی۔ ان لوگوں کو جنھوں نے شہرت حاصل کرنے کے لیے فیشن کے مطابق لکھے لکھائے اور پامال مضامین کو پھر سے باندھ کر اور پامال کر دیا تھا، ان پر سب سے سنگین الزام یہ ہے کہ ان کی مستقل تصنیف ایک بھی نہیں۔ ان کی سزا اس وقت مکمل سمجھی جائے گی جب وہ جیل سے ایک مستقل تصنیف پیش کر دیں گے۔

ایک صاحب پر الزام ہے کہ وہ بالکل معمولی سی بات کو غیر معمولی طول دے کر لکھتے ہوئے پکڑے گئے۔ غیر معمولی طوالت نے مسئلہ کو جو خاصہ سلجھا

سلجھایا تھا تفصیل میں ڈبو کر خاصہ الجھا دیا۔ ان کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ ان پر پبلک کا وقت اور دماغ خراب کرنے کے الزام میں مقدمہ چلایا جائے گا۔ فی الحال ان کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنی جملہ تصانیف کو مختصر کرنے کا کام شروع کر دیں جس کتاب کی تلخیص پیش کرنے میں وہ ناکام رہیں گے وہ ضبط کر لی جائے گی۔ ایک دوسری اطلاع کے بموجب جیل میں ان سے مختصر نویسی کی مشقت لی جا رہی ہے۔

ایک دوسرے مصنف چلتی ٹرین میں کچھ لکھتے ہوئے پکڑے گئے۔ ان کی تلاشی لینے پر کچھ بھی برآمد نہ ہو سکا۔ وہ جو کچھ لکھ رہے تھے اس میں محض پچھلی پڑھائی اور حاضر دماغی کا فتور پایا گیا۔ اعلانیہ میں کہا گیا ہے کہ وہ ریڈیو ٹاک تھی۔ اس قسم کے معرکے وہ بلا پڑھے لکھے مسلسل بیس سال سے انجام دے رہے تھے۔ ان کی مصروفیات کے سبب عملاً اب یہ ممکن نہیں کہ وہ لکھ پڑھ سکیں۔ اندازہ ہے کہ اب تک انھوں نے جتنی ٹاک دی ہیں ان کے سلسلہ میں ایک مزید ٹاک کے ذریعہ پبلک سے باقاعدہ معافی منگوائی جائے گی۔ فوج نے ان کے اوپر فریب دہی اور آنکھوں میں دھول جھونکنے کے سلسلے میں مقدمہ قائم کیا ہے۔ چھان بین ہو رہی ہے۔ توقع ہے کہ اس قسم کی گرفتاریاں اور بھی جلد ہی عمل میں آئیں گی جس سے پھر ایک ریڈیو سیریز "معافی ہی تو ہے" کے سلسلے میں نشر ہوا کرے گی۔

ایک بزرگ جو روپوش ہو گئے ہیں ان پر مغربی تصانیف کے حوالے اور غیر ملکی زبانوں کے الفاظ کی بھرمار کے سلسلے میں باز پرس کی جائے گی۔ ان کو عدالت میں حاضر ہونے کے بعد بطور ضمانت ایک مقالہ خالص اردو میں لکھ کر دینا ہوگا۔

گرفتار ہونے والوں میں سب سے دلچسپ ایک بزرگ ہیں جو "تحقیق لفظ ل" کے اوپر ہزار صفحات کا ایک مختصر رسالہ تصنیف کرتے

ہوئے پکڑے گئے۔ سارا طومار اس بات پر تھا کہ "دل" عربی ہے یا "ترکی؟" ان پر الزام ہے کہ جب تک وہ اختلاف کا پہلو پیدا نہ کرلیں قلم نہیں اٹھاتے۔ ان پر نقض امن اور پیپر کنٹرول ایکٹ کی خلاف ورزی کرکے کاغذ خراب کرنے کے سنگین الزامات ہیں۔ فوجی وکیل کا کہنا ہے کہ جو بات یہ لکھ رہے تھے اور نہ جانے کب تک لکھتے رہتے وہ بات دو لفظوں میں بھی بیان کی جا سکتی تھی کہ "آیا ..... ہے ..... یا ..... نہیں ہے؟"

کچھ بزرگوں نے شہرت حاصل کرنے کے لیے گمنام شعرا اور ادیبوں کے خطوط شائع کرنے شروع کر دیے تھے۔ ان پر الزام یہ تھا کہ جب ان شعرا کا کلام خراب تھا تو پھر تفصیل سے ان کے حالات بیان کرکے ان کو بدنام کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ ادیبوں کے خطوط شائع کرنے والوں پر فی الحال "ڈیڈ لیٹر آفس" میں داخلے پر پابندی عائد کر دی گئی ہے۔

بہت سے ایسے بزرگوں کا انکشاف ہوا جو اس انتظار میں رہتے کہ کوئی ادیب یا شاعر مرے تو اس پر کچھ کہیں۔ کچھ اور نہ سہی تو تاریخ وفات ہی سہی۔ ان لوگوں سے یہ وعدہ لے کر چھوڑ دیا گیا کہ وہ آئندہ صرف زندہ لوگوں پر لکھنے کے مجاز ہیں۔

وہ ادیب جو جدید اور قدیم کے سلسلے میں تنقیدیں پڑھ پڑھ کر الجھ گئے تھے ان کو فی الحال نئے قانون کے مطابق اس وقت تک اپنے خیالات کے اظہار کی اجازت نہیں ملے گی جب تک کہ وہ جدید اور قدیم کے گہرے مطالعے کے بعد اپنی فکر اور اظہار میں ایک توازن نہ پیدا کرلیں۔ اس درمیانی وقفہ میں ہر قسم کے بحث و مباحثہ سے ان کو سخت پرہیز کرایا جائے گا۔

ایک مشہور و معروف نقاد اور ان کے غیر معروف شاگرد نے جو تنقیدی قتلِ عام کے قائل ہیں، عدالت میں حلف اٹھایا کہ زندگی بھر وہ

www.taemeernews.com

کسی کی ایک لفظ بھی تعریف نہ کرسکے۔ اگر ایک جملہ میں تعریف بھی کی تو اگلے پیراگراف میں تکذیب بھی کر دی۔ ان کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اب بقیہ تمام زندگی ان تمام ادیبوں، شاعروں اور نقادوں کو جن کو وہ اپنے قلم سے بے ہوش کیا کرتے تھے ہوش میں لانے کے لیے ان کی خوبیاں تلاش کریں، خصوصاً وہ جن سے وہ ذاتی طور پر خوش نہیں ہیں ان کی خوبیاں برسرِ عدالت تحریری صورت میں سب سے پہلے پیش کریں اور اپنا ایجاد کردہ دل آزار طریقہ فوراً بند کردیں۔ ایک اطلاع یہ بھی ہے کہ شاید جلد ہی ان کو کسی مشرقی کتب خانہ میں قید کر دیا جائے جہاں ان کو مشرقی ادب پاروں کو خالص مشرقی انداز سے پرکھنے کی مفت تربیت دی جائے گی، جس کے انتظامات ہو رہے ہیں۔ پکڑے جانے والے افسانہ نگاروں میں زیادہ تعداد ان کی ہے جو قاری کو اجنبی سرزمینوں میں لے جاکر اجنبی کرداروں سے ملواتے تھے۔ اب غالباً ان سے دیسی کرداروں کے روزمرّہ کے مسائل کی عکاسی کروائی جائے گی۔ بہت سے افسانہ نگاروں پر یہ الزام تھا کہ جب تک اس دن کا اخبار نہ پڑھ لیا جائے جس دن افسانہ لکھا گیا تھا۔ موضوع کے ہنگامے کا قاری کے ذہن میں آنا ممکن نہیں۔ ایسے افسانہ نگاروں کو اس روش سے بچ کر چلنے کی ہدایت کے ساتھ حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنی جملہ تصانیف کے ساتھ "ببلوگرافی" کا بھی اضافہ کر دیا کریں تاکہ ہنگامے کا پتہ چلانے میں آسانی ہو۔ خاصی تعداد ان کی ہے جو کسی نہ کسی سے بری طرح متاثر تھے۔ ان کی انفرادیت واپس لانے کے لیے شاید اب ان کو سب سے الگ تھلگ رکھا جائے گا۔

ایک مشہور افسانہ نگار جن پر الزام ہے کہ وہ راہ چلتے مونگ پھلی کھاتے، دہی بڑوں کے پتے چاٹتے، بیڑی پیتے، سڑکوں پر آوارہ گھومتے، فاقہ مستی کرتے اور معمولی ملازمت کرتے تھے، بڑے شان دار افسانے لکھا کرتے تھے۔ مگر جب سے ان کو عزت، شہرت اور دولت ملی اور وہ فلمی

دنیا میں چلے گئے تو جاتے وقت وہ ساتھ میں اپنا قلم بھی لیتے گئے جس سے اب وہ خراب سے خراب افسانے لکھنے کی مشق کر رہے ہیں۔ چنانچہ اب ان کو مجبوراً پھر اسی معمولی ملازمت پر اس تنبیہہ کے ساتھ واپس بھیج دیا گیا ہے کہ اگر اب بھی اچھے افسانے نہیں لکھے گئے تو آئندہ ان کو اس سے بھی معمولی نوکری پر تعینات کیا جائے گا۔ ایک ان سے بھی زیادہ ممتاز افسانہ نگار جو کسی زمانہ میں تار گھر میں کلرکی کرتے تھے اور شان دار افسانے لکھتے تھے شہرت اور دولت راس آنے پر ان کو بھی "فلیریا" ہو گیا تھا۔ انھوں نے پڑھنے لکھنے سے توبہ کر لی اور بالکل اچھے ہو گئے۔ ان کو وارننگ دے دی گئی ہے کہ اگر انھوں نے جلد ہی اسی پیمانے پر افسانہ نگاری نہ شروع کر دی تو ان کے پرانے تار گھر ان کو بذریعہ تار واپس بلا لیا جائے گا۔ اس ضمن میں ایک معزز افسانہ نگار خاتون بھی آتی ہیں جو پہلے کسی اسکول میں استانی تھیں اور غضب کے افسانے لکھا کرتی تھیں، مگر جب سے انھوں نے کسی فلم ساز سے شادی کر لی اور فلمی دنیا سے لاکھوں روپے کمانے لگیں تب سے وہ اپنی افسانہ نگاری کی جانب سے غافل ہو گئی ہیں۔ ان استانی بی کو ان کے پرانے اسکول میں اسی ایک سو بیس روپے ماہوار والی جگہ پر واپس بھیجنے کے فوج انتظامات کر رہی ہے۔ ویسے ان سب پر 'بہ حیثیت مجموعی' دولت اور شہرت کے راس نہ لانے کے الزام میں مقدمہ چلایا جائے گا۔

کرنل آفریدی اور کیپٹن وحید نے بالکل نئے قسم کے ادیب گرفتار کر لیے ہیں جن کے اوپر مستقل سنسنی خیزی کا الزام ہے۔ ان لوگوں نے بتایا کہ وہ جاسوسی اور سائنسی ادب پیدا کر لیتے ہیں۔ تحقیقات سے پتہ چلا کہ سائنس ان کے خاندان میں کسی نے نہیں پڑھی، اس وجہ سے وہ بہ آسانی سائنسی ادب پیدا کر لیتے ہیں۔ ان میں سے ایک صاحب "لاشوں کا پہاڑ" بناتے ہوئے پکڑے گئے۔ دوسرے صاحب "بے گناہ قاتل" کو جنم دیتے ہوئے

گرفتار کر لیے گئے۔ ان سب پر سنسنی خیزی، راتوں کی نیند حرام کرنے، بھوک پیاس اڑانے، مار دھاڑ، قتل، چوری، اغوا، ڈاکہ سے رغبت دلانے، اخلاق خراب کرنے اور گھر سے بھاگنے تربیت دینے کے الزام میں مقدمے چلائے جائیں گے۔ ان میں ایک صاحب اپنے ہیرو کو روحوں کی دنیا میں پہنچانے کے لیے خون کے دریا بہاتے ہوئے اور ہیروئن کی تلاش میں پولیس کو پریشان کرتے ہوئے پکڑے جانے کے الزام میں ماخوذ ہیں۔ ان کے پاس سے بڑی تعداد میں افیون، اس کو کشید کرنے کے آلات اور قدیم مصری جادو سے متعلق کچھ نقلی کتابیں اور کچھ انگریزی کے جاسوسی ناول بھی برآمد کیے گئے جو ان کی شہرت کا اصل باعث تصور کیے جا رہے ہیں۔ جیل میں ان سب سے انسانوں اور انسانی مسائل پر لکھانے کی جبری مشق کرائی جائے گی۔

شاعروں کے بارے میں جو سنسنی خیز انکشافات ہوئے ہیں ان سے ان کی چال اور نقل و حرکت پر بخوبی روشنی پڑتی ہے۔ زیادہ تر اس وقت حراست میں ہیں۔ بقیہ کی تلاش جاری ہے۔ شعرا دوسروں کی زمینوں میں شعر کہتے، چائے خانوں یا مے خانوں میں دین و دنیا، بیوی بچوں سے ایک دم غافل پائے گئے۔ ان میں شاعر کم اور شاعر کے بھیس میں زیادہ تھے۔ فوج کی جانب سے ایک اعلانیہ میں بتایا گیا ہے کہ جملہ "بوہمین شعرا" فوراً اپنے آپ کو انسان ثابت کرنے کی کوشش کریں۔ فی الحال جو شاعر کماتا نہ ہوگا، بیوی بچوں کو ٹھیک سے نہ رکھتا ہوگا، اس کا کلام بحق فوج ضبط کر لیا جائے گا۔ اس کے علاوہ ان کو اپنے "دواوین" کی اصلاح، نظر ثانی اور مختصر کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ دوسروں کی زمینوں میں کہنے اور دوسروں کے رنگ کو اپنانے والوں کو دریا برد کیا جا رہا ہے۔ جو شعرا غزل کی گردن مارنے پر تیار رہتے تھے ان کو اب صرف غزل ہی کہنے کا لائسنس مل سکے گا اور آزاد نظم کے پرستاروں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ غزل کی مخالفت بند کریں

نظم کی نزاکتوں کو سمجھنے کی کوشش شروع کر دیں۔ شعرا کو خبردار کیا گیا ہے کہ وہ آبادیوں سے باہر ویرانوں میں جانا اور آبادیوں کو کوسنا فوراً بند کر دیں۔ مسلسل اور طویل نظمیں، غزلیں خلاف قانون قرار دے دی گئی ہیں۔

www.taemeernews.com

ملک ادب کے شمالی گوشوں سے خبر آئی ہے کہ وہاں بکثرت واہ واہ کرنے والے گرفتار کر لیے گئے جو مشاعروں میں صرف آواز پر آواز دے رہے تھے۔ مشاعروں پر شعرا اور انتخاب کی پابندی لازمی قرار دے دی گئی۔ مزید شعرا کو گرفتار کرنے کے سلسلے میں فی الحال فوج نے معذوری کا اظہار کر دیا ہے کیونکہ اس طرح آبادی اور فوج کا بیشتر حصہ حراست میں آجائے گا۔ اس لیے ان پر قاعدے قانون کی سختی کر دی گئی ہے۔ شعرا کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ محض شاعر نہ بنیں بلکہ کام کے آدمی بھی بنیں۔ گلے بازی کو سخت جرم قرار دیا گیا ہے۔

ایک شاعر رسالہ کو غزل بھیجتا ہوا پکڑا گیا۔ اس پر یہ الزام ہے کہ اس نے خود اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں سے "علامہ" اور "ایشیا کا عظیم ترین شاعر" وغیرہ لکھا تھا۔ اس پر دوسروں سے بھی جبراً اپنے آپ کو عظیم شاعر کہلوانے اور خلاف مرضی تعریفی اداریے لکھوانے کے جرم میں مقدمہ قائم کر دیا گیا ہے۔ ایک اور شاعر جو کسی اعلیٰ عہدہ پر فائز تھے اپنے اسٹینو سے خود اپنی ہی شان میں تنقیدی مقالہ لکھواتے ہوئے بروقت پکڑ لیے گئے۔ چوں کہ وہ شاعر خراب ہیں اور مقالہ اچھا تھا اس لیے اس کو ضائع کر دیا گیا۔ تلاشی لینے پر ان کے قبضہ سے کافی تعداد میں اس قسم کے جبریہ قصائد برآمد ہوئے۔ ایک نیوز بلیٹن میں تمام ماتحتوں کو حکام پر لکھنے سے باز رہنے کی تلقین کرتے ہوئے اس کو سخت جرم قرار دیا گیا ہے۔ خلاف ورزی کرنے والے ماتحتوں کو آگاہ کر دیا گیا ہے کہ آئندہ اگر اس پر عمل نہ کر سکے تو ان کو سزا کے طور پر افسر بنا دیا جائے گا۔ اس قسم کے تمام گراں قدر

www.taemeernews.com

مضامین کی تلاش ان کو ضائع کرنے کے لیے برابر جاری ہے۔

ایک ممتاز شاعر پر الزام ہے کہ جب تک وہ جیل میں تھے بہت اچھی چیزیں کہتے تھے، مگر جب سے جیل سے رہا ہوئے تقریباً خاموش ہیں۔ چنانچہ اس تدبیر میں کہ وہ دوبارہ اسی زور شور سے شاعری شروع کر دیں ان کو پھر جیل خانے روانہ کر دیا گیا ہے۔ ایک بزرگ شاعر جن پر الزام ہے کہ جب اقبال و اصغر وغیرہ نے شاعری شروع کی تھی تب وہ ان کو باقاعدہ اپنا معاصر و حریف خیال کر کے ان کی خیالی مخالفتیں کرتے رہتے تھے اور ہر پہلو سے ان کو اپنے سے کمتر درجے کا شاعر ثابت کرنے پر اپنی ساری آورد صرف کر دیتے تھے اور اب وہ فیض اور ان کے بعد کی نسل تک کے ہر ایک نئے شاعر کو اسی پیمانے پر اپنا حریف سمجھتے ہیں۔ ان کو خبردار کیا گیا ہے کہ وہ ادبی معرکوں اور دنگلوں میں جو وقت ضائع کر دیا کرتے ہیں اس کو اپنی شاعری پر صرف کر کے اسے بہتر بنانے کی کوشش کریں۔ اس سلسلہ میں ان کو اصلاح کا آخری موقع دیا گیا ہے مگر اس شرط پر کہ یا تو شرط منظور کریں ورنہ اپنے کو مردہ اعلان کر کے لکھنا چھوڑ دیں۔

کرنل مشفق الرحمٰن نے کئی ممتاز مزاح نگاروں کو حراست میں لے لیا۔ ان پر یہ الزام ہے کہ ان کے مزاحیہ مضامین پڑھ کر ہنسی بھی نہیں آتی، رونا تو دور کی بات ہے۔

اینٹی کرپشن ڈپارٹمنٹ نے کچھ ایسے ادیبوں اور شاعروں کو بھی گرفتار کیا ہے جو پیسے کمانے کے لیے دوسروں کے ناموں سے الٹا سیدھا لکھتے تھے یا ان کو مرے ہوئے ادیبوں کے نام سے منسوب کر کے غلط فائدہ اٹھاتے تھے۔ ان کو چار سو بیس کرنے کے جرم میں سزائیں دی جائیں گی۔ محکمہ نے چند ایسے صحافیوں کو بھی حراست میں لے لیا ہے جو مخالفت کر کے، بحثیں چلا کے، خواہ مخواہ ایک دوسرے پر کیچڑ اچھلوا کے روپیہ کماتے اور محض روپیہ

www.taemeernews.com

کی خاطر ہر اچھی چیز کی مخالفت کرتے تاکہ پڑھنے والے چونک اٹھیں اور اسی بہانے ان کا رسالہ چل نکلے۔ اکثر نے اپنے نام و شہرت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اپنی کتابیں ردی کاغذ پر چھاپ چھاپ کر کوڑیوں میں اشرفیاں کمائی تھیں۔ ان سب کی ضمانت کے لائیسنس ضبط کر کے ان کو حوالات میں بند کر دیا گیا ہے۔ محکمہ نے ان موسمی ادیبوں پر رسالہ نکالنے کی پابندی لگا دی ہے جو اس وقت تک ادیب رہتے ہیں جب تک ان کا رسالہ نکلتا رہتا ہے اور اس کے بعد وہ بھی رسالے کی پلٹن کے ساتھ میدان سے غائب ہو جاتے ہیں۔ سزا کے طور پر اب ان کو بلا رسالہ کے میدان میں لایا جائے گا۔ اینٹی کرپشن والوں نے ایسے بہترین ادب کے انتخاب کرنے والے برآمد کیے ہیں جو ہر سال اس وجہ سے انتخاب کرتے تھے تاکہ ان کی چیزیں بھی انتخاب میں آجائیں۔ یہ انتخابات ضائع کر دیے گئے۔ اب اینٹی کرپشن والے خود اپنی نگرانی میں نئے سرے سے سارے انتخاب کروا رہے ہیں۔ سزا کے طور پر ان لوگوں کی کوئی چیز انتخاب میں شامل نہیں کی جائے گی۔ آج شام کو اینٹی کرپشن والوں نے ایسے ادیب بھی گرفتار کیے جو ہر سال دوڑ دھوپ کر کے اور تعلقات کے بل بوتے پر غلط کتابوں پر (سال بھر میں شائع ہونے والی بہترین کتابوں کا) انعام حاصل کر لیتے تھے۔ ان سب کی ضمانتیں اس وقت تک منظور نہیں ہوں گی جب تک کہ وہ انعام کے روپے واپس اور جرمانہ ادا نہ کر دیں۔ محکمہ نے ایک ادیب کے گھر دوڑ بھیجی۔ وہ نرا شاعر نکلا جو اس وقت اپنی بیوی پر رعب جمانے کے لیے سوائے اپنے سارے شاعروں اور ادیبوں کو جاہل ثابت کرنے کے علاوہ اپنا کلام بے لگام بھی متواتر سنا رہا تھا جسے سن سن کر اس کی بیوی بیچاری سخت بور ہو رہی تھی۔ ان کو گرفتار کر لیا گیا۔ ان کو لے جاتے وقت بیوی نے فوج کا شکریہ ادا کیا۔

اس کے بعد ہوٹلوں اور چائے خانوں پر چھاپے مار کر بہت سے

www.taemeernews.com

شاعر اور ادیب دوسروں کی غیبت کرتے ہوئے گرفتار کر لیے گئے۔ پکڑے جانے والوں میں بہت سے "اینٹی لکچوئل" جو کافی ہاؤس میں آفاقی ادب کے سلجھے ہوئے مسائل کی بحثوں میں الجھے ہوئے تھے، ان پر اینٹی کرپشن والوں نے دو الزامات عائد کیے۔ ایک تو زیر بحث موضوع سے متعلق جن کتابوں کے حوالے دیے جا رہے تھے یا تو وہ زیر طبع تھیں یا ابھی تک پڑھی نہیں گئی تھیں، دوسرے سب ایک دوسرے پر اپنی قابلیت اور علم کا غلط سکہ جمانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ ان کے خلاف پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت مقدمہ چلایا جائے گا۔ فی الحال کافی ہاؤس میں ان کے داخلہ پر پابندی عاید کر دی گئی ہے۔ ایک حالیہ اعلان میں محکمہ نے ان تمام نوجوانوں کو ان کے کام پر واپس جانے کا حکم دے دیا ہے جنھیں "ادب" ہو گیا تھا یعنی وہ کرتے کچھ اور تھے اور رہتے ادب کی جان پر سوار تھے اور اپنے کام کے ساتھ ادب کی بھی مٹی پلید کیے ہوئے تھے۔

موجودہ انقلاب اور اصلاحات کا ہر حلقۂ ادب میں بے پناہ استقبال کیا جا رہا ہے۔ ادب میں انتشار پیدا کرنے والے اب تقریباً منتشر ہو گئے ہیں۔ ادب میں ایک توازن، سنجیدگی اور پائداری کی ہر طرف امید کی جا رہی ہے۔ "ادبی جمود" کا نعرہ لگانے والے "مارشل لا" کے طفیل میں اب مقالے لکھ لکھ کر ثابت کر رہے ہیں کہ ادب میں نہ کبھی جمود تھا اور نہ ہے۔ آگے چل کر "ادبی مارشل لا" کا دور تاریخ ادب میں ادب کے سنہری دور کے نام سے یاد کیا جائے گا جس میں زیادہ تر عظیم اور صالح ادب تخلیق ہوا اور تمام بنیادی کام انجام دیے گئے۔

---

www.taemeernews.com

شکر کا چکّر

صبح صبح گڑ کی چائے پلانے کے بعد والد صاحب نے راشن کارڈ اور دام دیتے ہوئے ہم سے کہا

"بیٹا شکر لانے کی کوشش کرو!"

کپڑا لے کر میں شکر لانے کے لیے چلا تو والدہ نے پکارا

"ٹھہرو! امام ضامن تو بندھوا لو"

بھابھی بولیں

"ہاں اور نہیں تو کیا، دن کا کھانا بھی کھا لو اور رات کا ساتھ لیتے جاؤ"

دادی جان نے پکار کر والدہ سے کہا

"ارے بہو، اس غریب کا دودھ تو بخش دو"

بھائی رجب بولے

"دیکھو ساتھ میں بستر لیتے جاؤ اور کچھ دام بھی رکھ لو۔ نہ جانے کیا ضرورت پڑ جائے!"

بڑی بہن نے بلائیں لیتے ہوئے اپنا فرسٹ ایڈ کا بکس دیتے ہوئے کہا

"احتیاطاً اسے بھی ساتھ لیتے جاؤ"

دولھا بھائی آنکھوں میں آنسو لاتے ہوئے بولے

"شکر لینے جا رہے ہو تو ہم لوگوں کا کہا سنا بھی معاف کرتے جاؤ"

بیگم نے آب دیدہ ہو کر دوپٹے سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا

www.taemeernews.com

"مجھے کس پر چھوڑے جا رہے ہیں؟"

چاروں طرف سے جو یلغار ہوئی تو میں بوکھلا گیا اور سوالیہ نشان بنتے ہوئے بولا

"کون سا میدان جنگ میں جا رہا ہوں۔ ارے اسی گلی کے نکڑ پر تو شکر کی دکان ہے، ایک جھپاکے میں گیا اور لایا، کیا اس سے پہلے گیہوں، مٹی کا تیل، دیا سلائی، ریزگاری اور کپڑا نہیں لایا ہوں۔"

خانسامن بوا بلائیں لیتی ہوئی بولیں

"خدا سلامت رکھے، چاندسے مکھڑے پر سہرا سجے! شکر لینے جائیں بھیا کے دشمن، آخر ہم نمک خوار کب کام آئیں گے؟"

والد صاحب نے فیصلہ کن انداز میں کہا

"نہیں! وہ زمانے گئے، جب عورتیں کنٹرول سے شکر لے آتی تھیں۔ کیا مرد چوڑی پہن کر گھر میں بیٹھنے کے لیے رہ گئے ہیں۔ جاؤ بیٹا! مگر ہاتھ پیر بچائے رکھنا، بھیڑ بھاڑ سے گھبرا نہ جانا"

چچا جان بولے

"کہاں لڑکے کو بے وقت ہلکان کرنے بھیج رہے ہو۔ صبح کے سات بج چکے ہیں۔ لوگ سر شام ہی بستر لے کر شکر کی لائن میں ڈٹ جاتے ہیں یا تاروں کی چھاؤں میں پہنچ جاتے ہیں تب کہیں شکر ملنے کی نوبت آتی ہے۔"

چھوٹے بھائی نے کہا

"آج اخبار میں آیا ہے، شکر کی لائنوں میں جگہ جگہ فوج داریاں ہو رہی ہیں"

اس کے بعد انھوں نے اپنے ٹیڈی پتلوں کی جیب میں سے نکل وسٹر نکال کر دیتے ہوئے کہا

"احتیاطاً جیب میں ڈال لیجیے۔"

www.taemeernews.com

گھر کے بڑوں چھوٹوں میں میرے جانے یا نہ جانے کے بارے میں بات ہو رہی تھی کہ میں شکر لینے کے لیے نکل پڑا۔

جب میں شکر کی دوکان پر پہنچا تو پہلے تو مجھے دھوکا ہوا کہ شکر کی دکان پر نہیں بلکہ کسی ایسے سنیما گھر کے سامنے پہنچ گیا ہوں جس میں کوئی مار دھاڑ والی نئی فلم آج ہی لگی ہے اور پورا شہر اسے آج ہی دیکھ لینا چاہتا ہے۔ حد نظر تک شکر کی لائن میں لوگ چیونٹیوں کی طرح لگے ہوئے تھے اور اس لائن کو پولیس والے ڈنڈوں کی مدد سے درست کر رہے ہیں۔

شکر کے بہت سے امیدواروں کے کپڑے تار تار ہو چکے تھے اور حلیہ بتا رہا تھا کہ انھوں نے یہ جگہ بزورِ بازو حاصل کی ہے۔ اکثر بزرگ اپنی باری کے انتظار میں تسبیح لیے شکر حاصل کرنے والا کوئی جلالی وظیفہ پڑھ رہے تھے۔

ایک صاحب لائن ہی میں کھڑے کھڑے بری طرح چیخ رہے تھے "ہائے میں لٹ گیا"۔ معلوم ہوا کسی نے موقع پاکر ان کی جیب صاف کر دی۔

لائن میں جہاں بھی ذرا سکون تھا وہاں لوگ اپنی باری کے انتظار میں بیٹھے خرّاٹے لے رہے تھے۔ ایک آدھ زندہ دلانِ لکھنؤ نے ماحول سے بیزار ہو کر وقت گزاری کے لیے کجری چھیڑ دی تھی۔ کچھ کرکٹ کے شائقین لائن میں جمے ٹرانسسٹر پر کمنٹری سن رہے تھے۔

کچھ لوگ بغیر لائن والوں سے اپنی جگہ کا سودا کر رہے تھے اور کچھ کہے بغیر لائن والے، لائن میں لگے ہوؤں سے پوچھتے پھر رہے تھے۔

"آپ میں سے کوئی صاحب چاہیں تو اپنی جگہ بیچ دیں"

غرض لائن کا جائزہ لینے کے بعد شکر ملنے کی امید میں، کہ امید پر دنیا قائم ہے، کلمۂ شہادت پڑھتا ہوا میں لائن میں کھڑا ہو گیا۔ مجھے لائن میں لگے زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ میرے پیچھے بھی کئی حضرات لائن میں لگ گئے گویا اب یہ تھا کہ اگر مجھے شکر نہ ملی تو دوسرے سیکڑوں کو بھی نہیں ملی اور مجھے نہیں ملی

www.taemeernews.com

تو کیا ہوا، ہزاروں مجھ سے پہلے آنے والوں کو تو مل گئی۔ اس جمہوری خیال سے مجھے بڑی تقویت پہنچی اور میں لائن میں ڈٹ کر کھڑا ہو گیا۔

جب لائن میں کھڑے کھڑے تھک گیا تو کچھ دیر تو تکلفاً اکڑوں بیٹھا۔ اس کے بعد مجبوراً پلتھی مار کر زمین پر بیٹھ گیا اور اپنے برابر والے کے اخبار والے کا مطالعہ کرنے لگا۔ اخبار میں لکھا تھا "شکر کی مصنوعی قلت ختم۔ شکر کی کمی پر قابو پا لیا گیا۔" اس کے بعد وزیرِ غذا نے شکر کا مسئلہ دوسرے مسائل کی طرح بخیر و خوبی حل ہو جانے پر اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ "ہمیں سوشلزم حاصل کرنے کے لیے اس قسم کے مسائل کو حل کرتے رہنا ضروری ہے۔" اس کے بعد اخبار سے نفرت ہو گئی اور نظریں اس طرف سے ہٹا کر پھر لائن کا جائزہ لینے لگا۔ اتنے میں لائن میں کسی بانکے نے کسی کے چاقو مار دیا، جگہ پر جھگڑا شروع ہوا تھا اور بات آگے بڑھ گئی تھی۔ اس بھگدڑ نہ مچی کیوں کہ جگہ چھوڑنے پر کوئی تیار نہ تھا۔ البتہ ایک زور کا ریلا آیا اور اسی کے زور کے ساتھ میں لائن کے باہر تھا۔ اب جن صاحب کے آگے پیچھے میں گھنٹوں سے کھڑا تھا ان تک نے مجھے پہچاننے سے صاف انکار کر دیا۔ میں ہوں کرا ایک ایک کو لاکھ یقین دلا رہا ہوں، حلف تک اٹھانے کے لیے تیار ہوں، ایک آدھ کچھ پگھلا بھی مگر پیچھے والوں نے ہنگامہ کرنا شروع کر دیا کہ

"واہ صاحب! واہ ہم بے وقوف ہیں کہ صبح سے کھڑے ہیں۔ یہ بھی کوئی طریقہ ہے۔ جب سب سے بعد میں آئے ہیں تو سب کے آخر میں کھڑے ہوئیے۔"

ایک خوانچہ والے نے فقرہ کسا

"بابو تھک گئے ہوگے! آؤ پہلے کچھ کھا پی لو۔"

ایک صاحب کو میں نے لائن میں جگہ دی تھی اور دوسرے صاحب سے گھنٹوں میں بات چیت کرتا رہا تھا۔ میں نے دونوں کو لاکھ لاکھ یاد

www.taemeernews.com

دلایا مگر دونوں صاف مکر گئے اور بولے

"میاں ہوش کی باتیں کرو، دیکھ رہے ہو لائن ؟ بھلا اس میں کوئی کسی کو پہچان سکتا ہے !"

سامنے ہی ایک سیاسی لیڈر وقت گزاری کے لیے اپنے برابر والے شخص کو سمجھا رہا تھا

"کل تک کسے یقین تھا کہ ملک آزاد ہو جائے گا۔ تم جانو چٹکی بجانے میں تو سوراج مل گیا۔ سوشلزم لانے کی بات کا اس وقت جتنا چاہو مذاق اڑا لو اور چاہے اسے خیالی پلاؤ کہو چاہے کاغذی گھوڑا مگر جان لو کہ آج نہیں تو کل۔ بس اب سوشلزم آیا ہی سمجھو !"

کسی مسخرے نے یہ سن کر پیچھے سے نعرہ لگایا "انقلاب !" اور زندہ باد کے ساتھ جو زور کا ریلا آیا تو سیاسی لیڈر لائن سے بوتل کے کاگ کی طرح نکل کر باہر آ گئے۔

اب نیتا جی ہیں کہ لوگوں سے لاکھ لاکھ خوشامدیں کر رہے ہیں، لال پیلی آنکھیں دکھا رہے ہیں، پھر نرم پڑ جاتے ہیں، کبھی گرم ہوتے ہیں تو کبھی تقریر شروع کر دیتے ہیں۔ "ڈسپلن" جیسے الفاظ منھ سے نکالتے ہیں مگر کیا مجال جو کوئی شکر خوارٹس سے مس بھی ہو۔ ان کے مخاطب نے بھی ان کو پہچاننے سے انکار کر دیا۔ انھوں نے پولیس بلانے اور بھوک ہڑتال کرنے کی دھمکی دی مگر وہ بھی بے سود ہو گئی۔ اس کے بعد نیتا جی نے لائن کی صورتِ حال کا اندازہ لگانے کے لیے طوفانی دورہ کیا۔ میں بھی سائے کی طرح ان کے ساتھ لگا رہا کہ شاید اسی بہانے لائن میں دوبارہ شامل ہونے کی کوئی صورت پیدا ہو جائے۔

انھوں نے ایک جگہ پہنچ کر کسی کے کان میں کچھ کہا۔ کوٹہ یا پرمٹ یا کوئی ایسا ہی لفظ تھا۔ مگر اس لفظ نے علی بابا کے کھل جا سم سم کی طرح جادو

لائن میں کھٹ سے اتنی گنجائش پیدا کر دی کہ ایک آدمی اس میں اچھی طرح کھڑا ہو سکتا تھا۔ لہٰذا میں نے فوراً لائن کے اس خلا کو پر کر دیا۔

نیتا جی اور ان کے ہمدردنے لاکھ لاکھ زور مارا مگر میں ٹس سے مس نہ ہوا۔ میرا کہنا تھا کہ لڑکا سمجھ کر دبا لیجیے ورنہ میں تو اس جگہ پر صبح سے کھڑا ہوں۔ مثل مشہور ہے کہ جب اچھے دن آتے ہیں تو پرائے بھی اپنے ہو جاتے ہیں۔

لہٰذا دو ایک حمائتی بھی پیدا ہو گئے اور ایک آدھ نے گواہی بھی دے دی۔ جن لوگوں کو سیاسی لیڈروں سے خدا واسطے کا بیر تھا وہ سب میری طرف سے بولنے لگے اور بولے" بھائی آپ کیا کہہ رہے ہیں ہم تو ان کو صبح سے لائن میں دیکھ رہے ہیں۔

اب تو نیتا جی مرنے مارنے پر تیار ہو گئے۔ میں نے بھی طے کر لیا کہ جان دے دوں گا مگر لائن نہ چھوڑوں گا۔

سیاسی لیڈر صاحب لائن کی جگہ حاصل کرنے کو کونسل کی ممبری کے مسئلے کی طرح وقار کا سوال بنا چکے تھے۔ انھوں نے خوب خوب ہاتھ پیر مارے، پینترے دکھائے، کبھی معلوم ہوتا تھا کہ بس اب واقعی وہ بلوا کرا کے ہی دم لیں گے۔ مایوسی کے عالم میں انھوں نے فرقہ وارانہ جذبات ابھارنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا مگر جہاں اتنے شکر خورے ہوں وہاں بھلا یہ کیسے ممکن تھا۔

قریب تھا کہ وہ لائن میں آجائیں یا مجھے لائن سے نکلنا پڑے کہ اچانک شکر کی دوکان کے مالک نے بھونپو سے اعلان کیا کہ" دکان شکر ختم ہو جانے کی وجہ سے بند کی جاتی ہے"

یہ سنتے ہی میں نے سیاسی لیڈر سے کہا" پھر بھائی آپ ہی لائن میں آجائیے"

انھوں نے مجھے گھور کر کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔ لائن میں کھڑے لوگ کھل کھلا کر ہنسنے لگے۔ قبل اس کے کہ لائن والے مجمع کی شکل میں شکر کی دکان پر حملہ آور ہوں اور سیاسی لیڈر مجھ پر، میں لائن میں سے نکل کر اپنے گھر پہنچ چکا تھا۔

---

www.taemeernews.com

ستم ایجاد کرکٹ اور میں بیچارہ

میں کرکٹ سے اس لیے بھاگتا ہوں کہ اس میں کھیلنا کم پڑتا ہے اور محنت زیادہ کرنا پڑتی ہے۔ ساری محنت پر اس وقت پانی پھر جاتا ہے جب کھیلنے والی ایک ٹیم ہار جاتی ہے۔ ایمان کی بات ہے کہ ہم نے "سائنس" کو ہمیشہ رشک کی نظروں سے دیکھا مگر کبھی اس مضمون سے دل نہ لگا سکے۔

ہمارا بیانِ صفائی سننے کے بعد میر صاحب جل کر بولے

"میاں تمھاری باتوں سے کاہلی کی بو آتی ہے اور تمھارا رجحان درونِ خانہ قسم کے کھیلوں کی طرف معلوم ہوتا ہے۔ مگر یہ بتاؤ کہ بھلا کرکٹ کا سائنس سے کیا تعلق ہے۔ کیا بے سر کی بات کہہ دی تم نے۔؟"

عرض کیا

"کرکٹ کبھی کھیل بھی رہا ہوگا مگر اب تو میر صاحب یہ باقاعدہ ایک سائنس ہے اور سائنس بھی ایسی جس میں ایجاد و تحقیق کرنا آسان مگر ٹسٹ پلیر بننا دشوار۔"

"خوب! خوب! عدم واقفیت کی بھی ایک حد ہوا کرتی ہے۔ کون سا ٹسٹ پلیر عالم فاضل ہے۔ دو چار کو تعلیم سے دور کا تعلق ضرور ہے مگر بس اس حد تک کہ اکثر ابتدائی درجوں میں پاس فیل کی پرواہ کیے بغیر امتحان میں شریک ہو جاتے ہیں۔ بھلا اس کا علم و فضل سے کیا تعلق؟"

جواب دیا

"کرکٹ کے کھلاڑی کو اگر دیکھنا ہو تو درجے میں نہیں میدان میں دیکھیے۔"

www.taemeernews.com

چمک کر بولے

"میں تو پہلے ہی کہتا تھا بھلے آدمیوں کا کھیل ہے۔"

کہا

"جی بالکل نہیں۔! انتہائی رئیسانہ کھیل ہے۔"

"مگر بھلے آدمی بھی تو رئیس کہلاتے ہیں۔"

"ایسی بھی کیا ریاست کہ چہرہ لہولہان ہو جائے۔ دانت شہید ہو جائیں۔ خیر دانت تو بعد میں ٹوٹیں گے پہلے تو مارے سردی کے بجنے لگیں گے۔ میر صاحب یہ ممکن نہیں کہ اس چلّے کے جاڑے میں اور کھلے میدان میں مجبوراً کھیلنے والے لحاف اوڑھ کر رن بنایا کریں۔

بولے

"کرکٹ کی گرمی لحاف کی تاب کہاں لا سکتی ہے، پھر اتنے موٹے دستانے پہننے، پیڈ چڑھانے اور گارڈ باندھنے کے بعد سردی کا کیا سوال۔؟"

کہا

"شکریہ! سردی کا علاج تو آپ نے بتا کر خوف کچھ کم کر دیا لیکن اگر کھیلنے والوں کے پیروں کو نرم و نازک گیند کی سہولت بھی دی جائے تو فرسٹ ایڈ کی زحمت سے بے نیاز ہو کر بہ آسانی کرکٹ کھیلا جا سکتا ہے۔"

مسکراتے ہوئے بولے

"آپ کے خیالات اسپورٹس مین اسپرٹ کے سخت خلاف ہیں ورنہ کھلاڑی تو اس کو کہتے ہیں جو چوٹ کھا کر مسکرائے اور جیتنے والے سے ہاتھ ملائے۔"

"خیر ٹھٹھرنے اور مرنے سے نہیں ڈرتا مگر کھیل کھیل میں جان جانے کے تصور سے ضرور ہاتھ پیر ٹھنڈے ہونے لگتے ہیں۔"

میر صاحب بھلا میری باتوں میں کیا آتے۔ ہم نے بھی غنیمت جانا کہ یہ اس وقت محض کرکٹ کو کھیل منوا رہے ہیں۔ خیریت ہے کہ انھیں یہ نہیں سوجھی

www.taemeernews.com

کہ کھیل سے زیادہ ضروری نہانا ہوتا ہے ورنہ کڑکڑاتے جاڑے اور پالے میں ہمیں غسل خانے میں زبردستی بند کر کے اوپر سے اگر ٹھنڈے پانی کے فوارے کھول دیں تو پانی کے پہلے ہی چھینٹے کے ساتھ ہم غسل خانہ میں اکڑ کر تختہ ہو جائیں۔ کرکٹ میں زیادہ سے زیادہ زخمی ہو سکتے ہیں اور بعد میں علاج کر کے اچھے ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا نیم رضامندی کے انداز میں چھیڑتے ہوئے بولے

"میر صاحب کالرا اور پلیگ کی طرح یہ بھی تو متعدی وبا ہے۔ پھر وبائے عام میں مرنا مرزا غالبؔ نے بھی پسند نہ کیا تھا۔ تو آخر اس خاکسار کو شہید کروا کے آپ کو کیا ملے گا؟"

اتراتے ہوئے بولے

"خیر اگر تعلقات برقرار رکھنا ہیں تو کل ٹھیک دس بجے غریب خانے پر کمنٹری سننے آجائیے۔"

سوچا۔ کھیلنے سے سننا زیادہ آسان ہوگا۔ لہٰذا فوراً حامی بھر لی۔

دوسرے دن وعدے کے مطابق ٹھیک دس بجے میر صاحب کے یہاں پہنچے تو نقشہ ہی کچھ عجیب نظر آیا۔ ملاقاتی کمرے کی بیچ کی میز پر خاصدان کے بجائے ریڈیو رکھا ہوا تھا اور اس کا مائک کمرے کے باہر سڑک پر لگا ہوا تھا۔ مائک کے نیچے ایک بلیک بورڈ آویزاں تھا۔ میر صاحب ٹرانسسٹر لٹکائے کسی کو ہاتھوں ہاتھ کمرے میں لا کر صوفے پر بٹھاتے، کسی کو کمرے کے باہر فٹ پاتھ پر کھڑے رہنے کا حکم دیتے۔ انتظام کے ساتھ ساتھ باتیں بھی کرتے جاتے۔ ایک صاحب بولے

"کیوں نہ ہو بھائی! ٹسٹ کا معاملہ ہے۔ خدا کے فضل سے پہلا ٹسٹ ہم جیت چکے ہیں۔ اس بار بھی شانِ کریمی کے صدقے میں چھکے نہ چھڑوا دیے تو کوئی بات نہ ہوئی۔ اگر محب وطن ہمارے کھلاڑیوں کی کامیابی کے لیے گڑگڑا کر بارگاہِ رب العزت میں دعا مانگیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ میدان ہمارے ہاتھ نہ رہے۔ پھر اس میں شرم کی کیا بات ہے۔ دعا تو رستم بھی مقابلے سے پہلے مانگتا تھا، اور

www.taemeernews.com

غالب بھی آتا تھا"۔

ان کے مخاطب اپنی سفید براق نورانی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے آمین کہہ کر بولے

"بھائی دو رکعت شکرانہ تو میں نے بھی مانی ہے"۔

ہمارے میر صاحب پر اس وقت باقاعدہ "کرکٹیریا" کے دورے پڑ رہے تھے۔ بندے کا یہ عالم تھا کہ ان سے جس موضوع پر بھی بات کرتا اس کا جواب وہ کرکٹ کی بامحاورہ زبان میں دیتے۔

حضرات علم اور تجربے کے سلسلے میں ایک دوسرے پر رعب جمانے کے لیے اپنی اپنی عمریں ایک دوسرے سے بڑھا چڑھا کر بتا رہے تھے۔ ان میں سے ایک صاحب پوچھ بیٹھے

"میر صاحب آپ تو ان کے ہم عمر ہیں، بھلا بتائیے آپ کی عمر کیا ہو گی؟"

میر صاحب نے کہا

"اگلے ننانوے سال بعد بھی خاکسار ننانوے ناٹ آوٹ ہی رہے گا"۔

جب بات باپ دادا تک پہنچی تو میر صاحب نے دخل در معقولات کرتے ہوئے کہا

"بھائیو! میرے بڑوں کو کچھ نہ کہو، کیوں کہ ایک نہ ایک دن ہم سبھی کو ملک الموت کے ہاتھوں کیچ ہونا ہے"۔

اس کے بعد بے ثباتی عالم پر تبصرہ کرتے ہوئے بولے

"یہ دنیا ایک ٹسٹ میچ ہے۔ اس کے اوپننگ بیٹسن مین بابا آدم اور ماما حوا تھے۔ اس میچ کی پہلی اننگس چل رہی ہے اور دوسری میدان حشر میں ہوگی"۔

کسی نے پوچھا

"کیا قیامت آنے کے لیے روس اور امریکا میں جنگ ہونا ضروری ہے"۔

بولے

www.taemeernews.com

"بالکل! مگر قیامت سے پہلے دونوں میں ایٹمی ٹسٹ میچ ضرور ہوگا۔"

اتنے میں فٹ پاتھ سے نعرے لگنے لگے کہ وقت ہوگیا ریڈیو کھولیے!

ایک صاحب ترکاری کا جھولا لیے کمنٹری سن رہے تھے۔ ان کی باتوں سے معلوم ہوا کہ دفتر سے چھٹی لیے ہوئے ہیں اور ترکاری ابھی خریدی نہیں ہے۔

ایک صاحب زادے بغل میں بستہ دبائے اپنے ماسٹر کے ساتھ کھڑے کمنٹری سن رہے تھے۔ ماسٹر نے چلتے وقت شاگرد رشید سے اسکور پوچھا

اس میچ میں ہمارے ایک امریکی دوست مل گئے۔ ساتھ ہی ان کی فرم کے اسسٹنٹ بھی تھے۔ میں نے پوچھا

"آپ انھیں کام کے وقت میں کمنٹری سننے سے نہیں روکتے؟"

وہ بے بسی کے انداز میں بولے

"بھئی کسی کے مذہبی مشاغل میں مخل ہونے کی ذمہ داری کون اپنے سر لے۔"

ہم اپنے کسی دوست کے ساتھ چائے پینے ایک ہوٹل میں پہنچے۔ ہوٹل میں بڑے زور شور سے کمنٹری سنی جارہی تھی۔ لہذا چائے تو جاتے ہی مل گئی لیکن جگہ آخر تک نہ مل سکی۔ کمنٹری سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ ریڈیو اور ہوٹل دونوں کی کمنٹری ایک ساتھ چل رہی تھی۔ اور اس قسم کی آوازیں کانوں میں پڑ رہی تھیں۔

"دو چائے کارڈلے ٹورنس۔ ایک آملیٹ، چار سلائس ایک کافی ٹوٹل گوز ٹو۔ بیس آنے۔۔ ایک انڈا لگ آؤٹ۔۔۔ وغیرہ۔"

اتنے میں ہوٹل والے نے پوچھا

"کارڈلے اب تک کھیل رہا ہے؟"

"ہاں۔!"

ہوٹل والے نے غصہ میں آپے سے باہر ہو کر چیختے ہوئے کہا

"اگر کارڈلے اب بھی کھیل رہا ہے تو ریڈیو بند کردو۔"

اس کے بعد ہوٹل سے نکل کر اپنے غیر ملکی دوست کے ساتھ ان کے دفتر تک گیا۔

www.taemeernews.com

دفتر والے برابر فون پر اسکور پوچھ رہے تھے
ایک صاحب نے فون کیا
"ہلو۔ ہلو"
"یس ریلوے انکوائری"
"کیا اسکور ہے؟"
"یہ ریلوے انکوائری ہے بابا"
"تو آپ کو اسکور تک نہیں معلوم؟"
"جی بالکل نہیں"
"افوہ! حکومت نے بھی کیسے کیسے لوگ رکھ چھوڑے ہیں جو اسکور تک نہیں بتا سکتے۔ بھلا یہ حکومت چل سکتی ہے؟"
مجبوراً ان صاحب نے ٹیلی فون ایکسچینج سے رجوع کیا
"ایم۔ سی۔ سی۔ کا اسکور کیا ہے؟"
"۴ وکٹ پر ۱۹۰ ۔!"
"اور انگلینڈ کا اسکور؟"
"انگلینڈ ایم۔ سی۔ سی کی ٹیم کا دوسرا نام ہے"۔
تھوڑی دیر بعد پھر فون کیا
"ہلو! اسکور پلیز؟"
نہایت غضب ناک آواز آئی
"ایم۔ سی۔ سی۔ آل آوٹ
"ہلو! بھلا یہ کیسے ممکن ہے۔ ابھی ابھی تو آپ نے بتایا تھا کہ چار وکٹ گرے ہیں"
جواب میں خوف ناک آواز گرجی
"زیادہ پریشان نہ کیجیے۔ آپ نے غلط نمبر ملایا ہے۔

www.taemeernews.com

"اوہ ویری سوری رانگ نمبر"

اس حادثے پر ایک صاحب نے اپنی اسکور پوچھنے کی داستان غم سناتے ہوئے کہا

"میرے اسکور پوچھنے پر جواب آیا۔ اس وقت سارے کھلاڑی سو رہے ہیں اسکور بتانے سے کہیں ان کی آنکھ نہ کھل جائے"

"تو کیا اس وقت رات ہے؟"

"جی ہاں اس وقت رات کے ٹھیک دو بجے ہیں"

جھینپ مٹانے کے لیے کہا

"جی شکریہ! دراصل آپ سے اسکور کے بہانے وقت پوچھنا تھا"

صاحب اسی طرح جو میں ایک دن دفتر سے گھر پہنچا تو بیگم نے اسکور پوچھا میں نے کہا

"آج بالائی آمدنی میں صرف دس روپے ملے ہیں۔

اس پر بیگم صاحبہ نے بڑے زور سے ڈانٹا

"میں آمدنی نہیں میچ کا اسکور پوچھ رہی ہوں۔

چنانچہ جناب اسکور معلوم کرنے کے لیے الٹے پاؤں بنواڑی کی دکان تک جانا پڑا۔

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ہمارے ایک دوست ٹرانسسٹر لٹکائے ہمارے پاس آکر بیٹھ گئے۔ اتنے میں آواز آئی

"یہ آل انڈیا ریڈیو ہے۔ اب کمنٹری بند کی جاتی ہے" اور ہم میر صاحب سے دن بھر کا اسکور پوچھے بغیر گھر واپس آ گئے۔

---

www.taemeernews.com

۱۹۵۷ غدر کے اسباب

(ایک مورخ کے قلم سے)

غدر کے اسباب:

غدر کی اطلاع سب کو پہلے سے تھی۔ نجومیوں نے پیش گوئی اور لیڈروں نے تقریروں کے ذریعہ پہلے سے آگاہ کر دیا۔ حکومت کی جانب سے محکمہ حفظ ماتقدم نے سروے ڈیپارٹمنٹ کی خدمات حاصل کر کے غدر کے طول و عرض کی پیمائش کا بھی انتظام کر لیا تھا۔ عام بے چینی لوگوں میں پہلے سے تھی اور کسی خاص بے چینی کا انتظار تھا۔ یوں چھوٹے چھوٹے غدر پہلے بھی ہو چکے تھے مگر مورخ کی حیثیت سے ہم زیادہ سے زیادہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیر اہتمام منعقد کردہ غدر کے بعد ۱۹۴۷ء کے غدر کا نام لے سکتے ہیں۔ مگر چوں کہ یہ غدر آپس میں کچھ تقسیم ہو کر رہ گیا تھا، اس وجہ سے اس کی پوری تصویر ہمارے سامنے نہیں آنے پائی۔ پس ہم اس کو زیادہ سے زیادہ غدر بھوت کہہ سکتے ہیں۔

حکومت نے بطور حفظ ماتقدم بروقت ڈگیاں پٹوائیں، اپیلیں کیں، لوگوں سے کہلوایا۔ "جو غدر کا نام لے گا اس کو غدار قرار دیا جائے گا"۔ مگر لوگ ان سب باتوں سے متاثر نہ ہوئے۔ ایوان حکومت نے حزب مخالف کی مخالفت کے باوجود یہ بل پاس کر دیا کہ۔ سن ستاون کے بجائے سن چھپن 'الف' اور سن چھپن 'ب' کر دیا جائے تاکہ نہ سن ستاون آئے اور نہ غدر ہو۔ مگر مخالف جماعت نے اچانک انڈر گراونڈ ہو کر سن ستاون کے کیلنڈر چھپوا کر سارے

ملک کے طول و عرض میں تقسیم کرا دیے۔ لوگ پیشتر ہی بارود کی طرح پھٹنے کو تیار بیٹھے تھے۔ اوّل تو لوگ ملک آزاد کروانے پر کیا کم خفا تھے۔ پھر ملک غلط طریقہ پر آزاد کیا گیا تھا، خواہ مخواہ ریاستیں اور زمیں داریاں ضبط کر لی گئی تھیں۔ اگر ملک آزاد ہی کرانا تھا تو اتنی سی بات کے لیے انگریزوں سے ملک چھڑوانے کی کیا ضرورت تھی۔ پھر تقسیم بھی غلط ہوئی تھی۔ اس سلسلے میں کافی بخل سے کام لیا گیا تھا۔

آزاد ہندستان کے پہلے انگریز گورنر جنرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ہندستان سے رخصت ہوتے وقت جو پریس کانفرنس کی تھی اور اس میں پریس کے چند غیر ذمہ دار نمائندوں نے جو سوالات کیے تھے ان سے عوام میں کافی برہمی اور انتشار کے آثار نمایاں ہو چلے تھے۔ قارئین کی دل چسپی کے لیے ہم اس کے کچھ اقتباسات پیش کرتے ہیں۔

"لارڈ صاحب، آپ تو جا ہی رہے ہیں، اب تو بتا دیجیے کہ غدر کس نے کروایا تھا۔؟"

لارڈ صاحب نے منھ پھلا کر جواب دیا۔ "ہم نے غدر نہیں کرایا تھا۔"

"آپ نے باغیوں کو گولی سے کیوں اڑایا تھا۔؟"

"باغیوں کو خود باغیوں نے مارا تھا یا گولیوں نے۔ یہ باغیوں اور گولیوں کا معاملہ ہے۔ ہم اس پر کوئی رائے نہیں دے سکتے۔"

"مگر آپ لوگوں نے جو قتل عام کروائے تھے۔؟"

"مثلاً۔؟"

"غدر۔ جلیانوالہ باغ اور سن بیالیس وغیرہ۔"

"وہ تو برائے تنبیہہ چھوٹے چھوٹے اور ہلکے پھلکے لاٹھی چارج کروائے گئے تھے۔"

"اب دوبارہ آپ غدر کب کروا رہے ہیں۔؟"

"نہیں، اب آپ کو کروانا پڑے گا۔"

"آپ دوبارہ واپس کب آرہے ہیں۔؟" کسی نالائق نے سوال کیا، اور لارڈ صاحب کا موڈ خراب ہوگیا۔ انھوں نے اپنے ڈرائیور سے کہا۔ "ہماری گاڑی آگے بڑھائی جائے۔" (اقتباس دتی کرانیکل)

اسباب:

بہت دنوں سے غدر نہیں ہوا تھا۔ لوگ خواہش مند تھے کہ اب غدر ہونا چاہیے۔ اسی وجہ سے وہ سن ستاون کا سنہری موقع ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتے تھے۔ ملک میں ایک باقاعدہ غدر کی کمی شدت سے محسوس کی جارہی تھی۔ لوگوں کے منھ ۱۸۴۷ء کا خون لگ چکا تھا۔ بہت دنوں سے عوام کی بلوہ فساد کی حسرتوں کا خون ہورہا تھا۔ ساری ایٹامک اینرجی بڑے بڑے تعمیری منصوبوں پر فضول ضائع کی جارہی تھی۔ دنیا کے ہر ملک نے اپنی فوجوں کو زراعتی دستوں میں تبدیل کردیا تھا۔ خصوصاً روس، انگلستان، چین، امریکا اور ہندستان میں بڑی بڑی آرڈی نینس فیکٹریوں اور بم سازی کے کارخانوں کو صنعتی و زراعتی دستوں میں تبدیل کردیا گیا تھا۔ ہر چیز کی ارزانی ناقدری کی حد تک بڑھ چکی تھی۔ بموں اور مہلک ہتھیاروں اور ٹینکوں کی جگہ ٹریکٹر ڈھالے جارہے تھے جب کہ عوام چاہتے تھے کہ مزید ہیروشیما و ناگاساکی بنائے جائیں۔ ایٹم بم، ہائڈروجن بم اور جراثیمی بم امن کمیٹیوں کی نگرانی میں سمندر کے سینوں میں برابر دفن کیے جارہے تھے۔ عوام اس ملکی اور قومی نقصان پر بہت برافروختہ تھے۔ وہ خفا تھے کہ حکومت منصوبے کیوں بناتی ہے۔ آخر صوبے کیوں نہیں بناتی۔ صوبوں کی از سرِ نو تشکیل و علاقائی زبانوں پر غدر نہ ہونے دینے کا الزام حکومت عوام اور عوام حکومت کے سر تھوپنا چاہتے تھے۔

انڈیا آفس لائبریری لندن اور کولمبیا کمپنی کے ہز ماسٹر وائس ریکارڈ سے پتہ چلتا ہے کہ "اگر بجائے گرانی کے گرانی الاؤنس برقرار رکھا جاتا تو یہ نوبت نہ آنے پاتی۔" اگر ملک کو بیرونی ممالک کی امداد کے ذریعہ گوارستان، سکھستان،

www.taemeernews.com

موپلستان، ناگستان، کشمیرستان، طفلستان اور قبرستان ایسے مجوزہ کم ازکم پچیس حصوں میں تقسیم کر دیا جاتا تو نتائج اتنے ہولناک نہ ہونے پاتے۔" (مولانا بخش لائبریری پٹنہ کا ریکارڈ)۔" غدر کے ذمہ دار سب سے زیادہ ملک کے مقتدر رسائل اور پبلشر ہیں جنھوں نے غدر نمبر نکالنے کے لیے غدریہ حالات کو ہوا دی"۔ محکمہ موسمات کی اطلاع کے مطابق غدر کا طوفان اپنے صحیح وقت پر آیا۔ غدر کا آنا ضروری تھا، اگر اس وقت غدر نہ آتا تو زلزلہ آتا۔ بقول سڈنی کاٹن۔"زلزلے سے غدر ہمیشہ بہتر ہوتا ہے۔" غدر کے صحیح حالات اور عینی مشاہدات کی نایابی کا سبب یہ ہے کہ غدر آتے ہی یا تو پریس والے چھٹی لے کر اپنے اپنے گھروں کو چل دیے، یا گھر بیٹھ رہے۔ جو ہوش میں تھے بے ہوش ہو گئے اور ہوش آنے پر غدر فرو ہو چکا تھا۔

ملک کے سیاست دانوں اور ادیبوں میں غدر ہونے اور نہ ہونے پر وسیع پیمانے پر مناظرے چھڑ گئے تھے، کچھ لوگ چاہتے تھے کہ غدر کا صرف استقبال کیا جائے، اس کی شان دار جوبلی منائی جائے، غدر نمبر اور غدر ڈے ہوں۔ یہ لوگ نرم جماعت سے تعلق رکھتے تھے۔ مگر اکثریت ان کے خلاف تھی جن کا تعلق گرم پارٹی سے تھا۔ یہ ماضی کا ماتم پسند نہ کرتے تھے اور خواہاں تھے کہ ان کے بزرگوں نے ۱۸۵۷ء میں غدر کی جس تقریب کی بنیاد ڈالی تھی اس کا جشن صد سالہ منائیں اور جیسا کہ فرنگیوں نے طے کیا تھا، انسانیت کی لاش پر فاتحہ پڑھیں تاکہ اس کا ثواب ان کی روحوں کو پہنچ سکے اور ابلیس اعظم ان کو جوار رحمت میں جگہ دے سکے۔ ماضی کی روایات کو زندہ رکھنے کے لیے سن سینتالیس کی تقلید اشد ضروری تھی۔

تاریخ:

آل احمد سرور، فیض احمد فیض اور سردار جعفری وغیرہ نے غدر کی تاریخ کہی۔

www.taemeernews.com

فیض ـــــ گلوں نے رنگ بھرا ہے بہار گزری ہے
کہ عندلیب غدر نغمہ بار گزری ہے

۶۱۱۰۳۲۲۷۴ ۱۳۰۷ھ

جعفری ـــــ تفنگ و تیغ کو بڑھ کر ذرا سلامی دو
کہ سرخ پوش مرا غدر شہسوار آیا

۱۹۵۷ء

لٹن لائبریری علی گڑھ (شعبۂ مخطوطات) کے پرانے کرم خوردہ نسخہ جات میں ہم کو ایک تاریخ پروفیسر آل احمد سرور کی لکھی ہوئی ملتی ہے۔

اے گل بتو خرسندم تو بوئے غدر داری

A:D. ۱۹۵۷

(بشکریہ لٹن لائبریری علی گڑھ)

شروعات:

غدر اچانک شروع ہوگیا، غدر صحیح وقت پر یعنی ۲۶ جون ۱۹۵۷ء دن کے بارہ بجے شروع ہوا، ہم اس کے بارے میں بالکل دعوے سے نہیں کہہ سکتے کہ غدر پنجاب سے شروع ہوا یا یو، پی سے یا دونوں جگہ ساتھ ساتھ لیکن جو مواد دست یاب ہوا ہے اس سے یو، پی کا نمبر آگے معلوم ہوتا ہے۔ غدر کا اہتمام ہندستان میں کیا گیا تھا۔ مگر برصغیر کے دوسرے ممالک لنکا، افغانستان، نیپال وغیرہ میں بھی پھیل گیا تھا۔ جیسا کہ تاریخی دستاویز سے ثابت ہوتا ہے۔ سب سے پہلے مرزا پور کی چھاونی میں مرزا پھویا کے گھر کے سامنے سے شروع ہوا۔ واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ مسمی منگل پانڈے (کہ جن کے دادا منگل پانڈے جنھوں نے ۱۸۵۷ء میرٹھ چھاونی میں چربی لگے کارتوس استعمال کرنے سے انکار کر کے غدر کا آغاز کیا تھا) جب گورنمنٹ راشن ڈپو سے گیہوں لینے گیا تو دکان دار نے اس کو گیہوں ایک روپیہ کے ڈھائی سیر کے عوض دس سیر اس کے پلے باندھنے کی کوشش کر کے اس کے سادہ و معصوم جذبات سے کھیلنے کی کوشش کی ـــــ اس نے

لاکھ سمجھایا بھی ـــــ "نہیں بھائی ہم روپے کے ڈھائی سیر ہمیشہ لے جاتے تھے ہم کو ڈھائی سیر دو ـــــ مگر دکان دار نے جھگڑا کرتے ہوئے کہا

"ہم دس سیر سے ایک تولہ کم نہیں دے سکتے، کیوں کہ یہ حکومت کا حکم ہے۔"

اس طرح دکان دار نے سستا اور زیادہ سودا دینے کے فریب میں منگل پانڈے کے جذبات کو مشتعل کرنا چاہا تو وہ اور بھی مشتعل ہو گیا۔ شاید منگل پانڈے اس پر بھی صبر کر لیتا۔ مگر جب اس کو روپے کے چالیس آنے لوٹانے کی کوشش کی گئی تو اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور اس نے غصے میں پاگل ہو کر تین چار کو وہیں ڈھیر کر دیا اور اپنا ریوالور بلند کر کے اعلان کر دیا ہم اس حکومت کا خاتمہ کر دیں گے جو اس قسم کے سستے سودے بازی کے ذریعہ سمجھوتہ کرنا چاہتی ہے ـــ"

فوج و سپاہیوں نے منگل کا ساتھ دیا اور دیکھتے دیکھتے منگل کی اولاد منگل نے جنگل کے منگل میں دنگل برپا کر دیا ـــ چھاؤنی میں آگ لگا دی گئی، افسران کو گولی سے اڑا دیا گیا، اور دلّی چلو کا نعرہ بلند کر دیا گیا۔

غدر:

انگریزوں کے اسباب باندھنے ہی کے وقت سے غدر کے اسباب پیدا ہو چلے تھے۔ جیسا کہ ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں۔ مرزا پور کی بغاوت اور دلّی چلو کے نعرے نے پورے ملک میں بغاوت کی آگ پھیلا دی۔ سب سے پہلے کشمیر کے بجری بیڑے نے اپنے باغی ہونے کی اطلاع بذریعہ تار وزیر حرب اور وزیر اعظم کو دی۔ حکومت کے ذمہ داروں نے باغیوں میں نظم و نسق برقرار رکھنے کی خاطر ان کی قیادت اپنے ہاتھوں میں لے لی۔ اور دلّی میں ان کے استقبال کے لیے آل پارٹیز غدر کنونشن کی ایکشن کمیٹی نے ملک بھر کی تمام غدر یونٹس سے بذریعہ ریڈیو غدر کے کامیاب بنانے کی اپیل کی چھوٹی بڑی تعداد میں باغیوں کے دستے دلی کی طرف بڑھنے لگے۔ ساری خلقت دلّی کی طرف ٹوٹ پڑی۔ روزانہ شام کو وزیر اعظم لال قلعے کی برجیوں پر کھڑے ہو کر دوربین سے باغیوں کا تماشہ

www.taemeernews.com

دیکھتے۔ خود انھوں نے باغیوں کو سلامتی امن اور Co-existence کا پیغام بھیجا جو آج تک لال قلعے کے تاریخی میوزیم کے اندر میموریل کارنر میں محفوظ ہے۔ مگر میموریل کارنر اکالیوں اور مرہٹوں کی یورش میں تباہ ہو گیا۔ امن کے پیغام نے مجاہدین کے سینوں میں آگ لگا دی۔ ویسے بھی برابر اطراف وجوانب سے خبریں آ رہی تھیں کہ باغی امن کمیٹیوں کے دفاتر، تعلیمی درس گاہوں، ہسپتالوں، ریڈ کراس اور دوسرے سماجی اداروں میں آگ لگا اور تاپ رہے ہیں۔

حالات:

حالات بہت نازک تھے۔ تمام فوجیں اور صوبے خود مختار ہو کر باغیوں میں شامل ہو گئے تھے، ہر طرف بدامنی اور طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔ خوف و دہشت کا یہ عالم تھا کہ مائیں اپنے جوان جوان کلیجے کے ٹکڑوں کو گھروں میں اپنے سینوں سے لگائے بیٹھی تھیں۔ اگر وہ ذرا بازار میں سودا سلف خریدنے بھی نکلتے تو انھیں فوراً دفاتر کے ڈائرکٹر اور کمپنیوں کے منیجر زبردستی پکڑ لیتے۔

"چلیے چل کر براشیل کے منیجر ہو جائیے۔ ہم آپ کو چھ ہزار ماہانہ تنخواہ دیں ــــ" اب وہ لاکھ خوشامد کر رہا ہے اور کہہ رہا ہے ــــ "بھیا میں تو اپنی ماں کے لیے بازار سے دو پیسے کے پان لینے آیا تھا۔ اگر تم نے مجھے لے جا کر براشیل کا منیجر بنا دیا تو اماں کو پان لے جا کر کون دے گا۔ آسمان کے فرشتے یا زمین کے بھوت، پھر میں تو صرف میٹرک پاس ہوں، مجھے تو ساٹھ روپے کی کلرکی چاہیے ہے، کلرکی، مجھے اتنا بڑا آفیسر نہیں بننا ہے ــــ" اور تیل والے ہنستے ــ پھر خوشامدانہ لہجہ میں کہتے ــــ "ارے ہم تو صرف آپ کو منیجر بنا رہے ہیں۔ آپ ہم سے کچھ زیادہ تو مانگ کر دیکھیے ــ آخر آپ تیل کا کام کر کے تیلی ہی تو رہیں گے۔ پھر ہمارا کام تو صرف آٹھویں پاس سے بھی چل جاتا، آپ تو میٹرک ہیں میٹرک ــ ہمیں آپ کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ آپ کے تیلی ہو جانے سے آپ کی ذات والا صفات پر جو اثر پڑے گا آپ بلا اس کا لحاظ کیے ہمارا

کام کریں گے ــــ" مگر نوجوان روتا پیٹتا ــــ نہیں نہیں ــــ خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو ــــ مجھے جانے دو ــــ میں کلرک پیدا ہوا ہوں، مجھے کلرک ہی رہنے دو ظالمو ــــ مجھ سے میری کلرکی نہ چھینو ــــ مجھ پر رحم کرو رحم ــــ"

اگر باغی بروقت انھیں بچا نہ لیتے تو ان کو کمپنی یا دفتر والے زبردستی کام دلانے پکڑ کر لے جاتے۔ روزگار کا ہوّا لوگوں پر اس بری طرح سوار تھا کہ وہ سرِشام ہی اندر سے اپنے گھروں کے کواڑ بند کر بیٹھ رہتے۔ اگر مجبوراً یا بھولے بھٹکے کوئی دن میں بازار کی طرف نکل جاتا تو دکان دار منوں غلّہ کپڑوں کے تھان کے تھان، ہر قسم کی ضروریات و آسائشِ زندگی بے انتہا ریزگاری و نوٹ اس کے سر منڈھ دیتے ــــ

شادی بیاہ اور روزگار کا یہ عالم تھا کہ سرکاری گرگے ہر طرف برابر تاک میں لگے رہتے۔ اگر مخبری ہو جاتی کہ فلاں شخص، اس کا لڑکا یا خاندان میں دور دراز میں کوئی بے روزگار یا کنوارا ہے یا اس کے پاس صرف ایک مکان ہے یا محض ایک نوکری یا ایک بیوی ہے تو زبردستی سرکاری طور پر اس کا اغوا کر کے اس کو نوکریوں اور چھوکریوں سے لاد دیا جاتا۔ اور جبراً قہراً کئی کئی کوٹھیوں اور بنگلوں کا مالک بننا پڑتا۔ لوگ اپنی اپنی مصیبتوں اور پریشانیوں سے نجات پانے کے لیے جنگلوں کی طرف نکل بھاگے۔ بے چارے کنوارے اگر عیاشی کے لیے چکلوں کا رُخ کرتے تو انھیں اس سلسلے میں بڑی مایوسی ہوتی۔ کیوں کہ تمام طوائفیں تیرتھ یاتراؤں وغیرہ کے لیے چل دی تھیں۔ یا خیر سگالی وفد لے کر ممالک غیر میں اپنے اپنے ملکوں کی نمائندگی کرنے کو سدھار چکی تھیں۔

ظلم و ستم کی حد یہ تھی کہ عوام طوائفیں چاہتے تھے اور حکومت اُن کے گلے بیویاں باندھنا چاہتی تھی۔

ملک میں لیڈروں کا پتہ نہ تھا۔ بڑی مشکل سے باغیوں کو پتہ لگا کر اجمیر میں ایک لیڈر موجود ہے۔ باغی بڑی بھاری تعداد میں اس کی زیارت کو جمع ہوئے اور

اس کی زندگی میں اس کا بڑا شان دار عرس دنوچندی کروائی۔ پھر اسے عجائب گھر میں محفوظ کر کے اس پر ٹکٹ لگا دیا۔ تعلیم کا یہ عالم تھا کہ لوگ جبرًا بڑی بڑی جماعتوں میں پڑھنے کے لیے بھیج دیے جاتے، مقابلے کے امتحانوں کا سال بھر برابر اشتہار نکلتا رہتا، آخر میں مجبور ہو کر حکومت باغیوں سے چھپ کر آبادیوں میں دھاوے مارتی اور تعلیم یافتہ نوجوانوں کو اغوا کر لیتی۔ سرکاری سپاہی ان اغوا شدگان کو امتحانات کے ہال میں لے جا کر بند کر دیتے۔ کامیاب ہونے کے لیے صرف امتحان میں شرکت ضروری ہوتی۔ اگر کوئی رشوت یا پگڑی دینے کی کوشش کرتا تو افسران اسے سمجھ نہ پاتے۔ آخر میں باغیوں کا زور اتنا بڑھ گیا اور لوگ نوکری کرنے کے لیے کسی بھاؤ راضی نہ ہوتے تو حکومت نے مجبورًا نجومیوں اور رمالوں کو پیش کش کی وہ اپنے علم و عمل سے ایسے لوگوں کے نام اور پتے بتائیں جو ہمارے کام آسکیں۔ نجومیوں کی نشان دہی پر حکومت کے چھاپہ مار دستے کلرکوں اور ریٹائر ملازموں تک کو اعلیٰ عہدوں پر تعینات کرنے کے لیے ان کے گھروں سے برآمد کرتے، اکثر اس سلسلے میں باغیوں و چھاپہ مار دستوں میں بڑی سخت جنگ بھی ہوتی۔

عدالتوں کو گواہ نہ ملتے۔ لوگ ڈر کے مارے گواہی دینے نہ آتے کہ کہیں اسی بہانے بلوا کر ہم کو سرکاری افسر یا وزیر نہ بنا دیا جائے۔

ڈگریاں ترکاری کی طرح سڑکوں پر اس طرح بکتیں جس طرح آغا لوگ دوائیں بیچتے ہیں۔ سوائے چند دیہاتیوں کے جو گھر سجانے کے لیے لے جاتے عام لوگ انھیں آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتے، یا معصوم بچے پتنگیں بنا کر اڑاتے۔ حکومت نے باغیوں کو بارہا پیش کش بھی کی کہ ــــ "ہم تنخواہیں اور بونس بڑھا دیں گے، تعلیم اور سستی کر دیں گے، عقل سے کام لیں گے، نوکریاں عام کر دیں گے، ٹیکس معقول کر دیں گے ــــ" مگر باغی یہ سب چاہتے ہی نہ تھے۔ ان باتوں سے وہ اور بھی مشتعل ہو جاتے۔

باغیوں کا راج:

پرویز جاگر قلعہ پرکاراؤ ابلیشوری پرساد کی سند سے یہ بات پایۂ ثبوت تک

پہنچ چکی ہے کہ دلی پر باغیوں کا قبضہ ڈھائی دن اور تین گھڑی رہا۔

www.tuemedinews.com

لوٹ مار وقتل عام:

باغیوں نے امن کمیٹیوں، ہسپتالوں، تعلیم گاہوں، ریڈکراس کے دفاتر، منصوبے بنانے والے مرکز، ٹڈی مارنے والے جہازوں، آگ بجھانے والے انجنوں، دفتر روزگار، اور اناج دلانے والے دفتروں، حفاظتی چوکیوں، پانی گھروں، بجلی گھروں اور صنعتی و زراعتی کارخانوں کو خوب لوٹا۔ انھیں جو بھی رہبری یا کام کرتا ملا اسے انھوں نے سولی پر چڑھا دیا۔

باغیوں میں پھوٹ:

عین اس وقت جب غدر اپنے نقطۂ انتہا پر پہنچ چکا تھا باغیوں میں پھوٹ پڑ گئی۔ اس کے بارے میں لوگ مختلف الرائے ہیں۔ کچھ کہتے ہیں کہ باغیوں نے پھوٹ کھالی تھی۔ مگر بقیہ کچھ اور سبب بتاتے ہیں یعنی یہ کہ لوگ غدر کی جوبلی منانا چاہتے تھے انھوں نے لوٹ مار کو پسند نہیں کیا اور حکومت سے، جو فرار ہو کر اپنے موسم گرما کے پہاڑی دفاتر میں روپوش ہو گئی تھی اور باغی ابھی ان بلندیوں تک نہ پہنچ سکے تھے انھوں نے حکومت سے خفیہ ساز باز کر لی۔ سازش کامیاب ہوئی۔ غدر کرنے والے رات کو خود اپنے ہی آدمیوں کے ہاتھوں گرفتار کر لیے گئے۔

واقعہ:

واقعہ یہ ہوا کہ نرم پارٹی جو صرف جوبلی منانا اور غدر نمبر نکالنا چاہتی تھی گرم پارٹی سے جو غارت گری پر آمادہ تھی، سے الگ ہونے کے باوجود بظاہر ملی ہوئی تھی، اس نے جشن غدر منانے کے بہانے مٹھائی کے ٹوکروں میں اپنے سپاہی اور میگزین منگوا لیے اور رات کے پچھلے پہر ان مسلح سپاہیوں نے دلّی دروازہ کھول دیا۔ حکومت کی فوجوں نے اچانک شبخون مارا جو کامیاب رہا۔ باغیوں کے تمام سرغنہ گرفتار کر لیے گئے۔ معمولی جھڑپوں کے بعد تمام باغیوں نے ہتھیار ڈال دیے اور عام معافی دامن و امان کی پیش کش کی۔

www.taemeernews.com

گرفتاریاں اور معافیاں :

عام باغیوں کو جرمانے ادا کرنے یا تابرخاست عدالت کی سزا دے کر چھوڑ دیا گیا، نابالغوں اور طالب علموں کو شبہ کا فائدہ دیتے ہوئے سال سال بھر کے نیک چلنی اور ضمانت و مچلکے بھروا کر چھوڑ دیا گیا۔

مقدمے و سزائیں :

جن کو سزا دینا تھا ان کو طویل و مختصر سزاؤں کا حکم سنا دیا گیا۔ پھر بھی باغیوں کی بڑی تعداد پر سختی کر کے انھیں رہا کر دیا گیا۔ اس کے بعد غدر کے قائدین پر مقدمہ چلانے کی تحریک ہوئی۔

تاریخی مقدمہ :

لال قلعے میں غدر کرانے والے باغیوں کے سرغنہ پر تاریخی مقدمہ چلایا گیا جس کی خصوصیت یہ تھی کہ اس کی کوئی تاریخ نہیں مقرر کی گئی تھی پھر بھی غالباً وہ سنیچر کا دن تھا۔ باغیوں کے بیانات شروع ہوئے۔ مجمع اس کثرت سے تھا کہ مجبوراً تماشائیوں پر ٹکٹ لگا یا گیا، بالغ نصف اور نابالغ دو گنے دام ادا کر کے تماشیوں کی گیلری میں بیٹھ سکتے تھے۔ پریس، وکلا، مجرمین، گواہان اور جیوری پر کوئی ٹکٹ نہیں لگایا گیا تھا۔ صرف ان سے پیسے لے لیے گئے تھے۔

باغیوں کے بیانات اور سزائیں :

سب سے پہلے باغیوں کے قائد بنگل پانڈے کو کمرۂ عدالت میں پیش کیا گیا۔ ان کے آتے ہی مجمع قابو سے باہر ہو گیا۔ شیم شیم اور ہیئر ہیئر کے نعروں اور پھولوں دگندے انڈوں کی بارش میں بنگل کو دوست و دشمن کی تمیز کرنا مشکل ہو گئی۔ مگر پھر بھی اس نے سب کا شکریہ ادا کیا۔ کیوں کہ مقدمہ لال قلعے کے فوجی کورٹ میں بصورت کورٹ مارشل ہوا تھا اس لیے مارشل نے بنگل سے اس کا بیان حلفی شروع کرنے کا حکم دیا۔

مارشل ——— "تم کو اپنی صفائی میں کچھ کہنا ہے؟"

www.taemeernews.com

بنگل ـــــ "صفائی کی ضرورت مجھے نہیں تم کو ہے ـــ"

"تم نے غدر کروایا! کیا یہ الزام درست ہے ـــ بولو ـــ ؟"

"ہاں مجھے فخر ہے کہ میں نے غدر کروایا ـــ"

"عدالت یہ جاننا چاہتی ہے کہ ایسا کیوں ہوا ـــ"

"عدالت اس کے اسباب جانتی ہے ـــ"

"اور تم کو یہ بھی معلوم ہے کہ تم حکومت کے باغی ہو ـــ"

"ہاں مجھے اپنے باغی ہونے پر ناز ہے ـــ"

"اور بغاوت کی سزا کیا ہے۔ یہ بھی جانتے ہو ـــ"

"تمھاری سزاؤں کی جس کو پروا ہو وہ ان کو جاننے کی کوشش کرے۔ بنگل اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔"

"حکومت تمھاری شکایات جاننا چاہتی ہے۔

"کیا حکومت یہ جاننا چاہتی ہے کہ بنگل باغی کیوں ہوا۔ کیا حکومت کو یہ علم نہیں ہے کہ اس نے روپیہ کے چالیس آنے اور ڈھائی سیر کے بجائے دس سیر کا اناج کر دیا۔ کیا حکومت نے ریاستیں اور زمیں داریاں نہیں ضبط کیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ حکومت نے اس کے لیے عوام کے نمائندوں سے بھی رائے لی تھی، ان کے جذبات کا بھی خیال کیا تھا۔ (عوام کے نعرے شیم شیم اور عدالت کی آڈر آڈر کی صدائیں) کیا حکومت نے منصوبے نہیں بنائے۔ ہر پانچ سال بعد ایک منصوبہ آخر کوئی حد بھی ہے اس تعمیر کی۔ اسے کوئی برداشت کر سکتا ہے؟ کیا آج مجھے گرفتار کرنے والے بتا سکتے ہیں کہ انھوں نے بے روزگاری کو کیوں ختم کر دیا۔ طوائفوں کو کیوں ختم کیا۔ کیا میں جھوٹ کہتا ہوں کہ ہمارے لیے تعلیم کو سستا اور آسان نہیں کیا گیا۔ پھر جب ہر چیز سستی اور آسان کر دی جائے گی تب ہماری نسل میں تلاش معاش و فاقہ مستی کا خمیر اور جستجو کا مادہ کہاں سے آئے گا۔ کیا حکومت کو علم نہیں کہ روزگار دلانے والے دفتروں نے ہمارے بیٹوں اور بیٹیوں کو زبردستی

www.taemeernews.com

روزگار دلا کر ہمارے سینوں پر کُدال اور پھاوڑے ڈریکٹر نہیں چلائے، ہماری معصوم حسرتوں نے ہمارے ناگاساکی اور ہیروشیما بنانے کے سنہرے خوابوں کو مسمار نہیں کیا؟

میں پوچھتا ہوں۔ کہاں ہیں وہ اربابِ حکومت جو اس وقت انگریزوں کو ملک سے نکال رہے تھے جنھوں نے ملک کی تقسیم کرتے وقت مقامی و علاقائی آزادیوں و خود مختاریوں کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔ جنھوں نے اپنی حکومت اور طاقت کے گھمنڈ میں صوبائی و علاقائی و سیاسی تعصب اور متعصب جماعتوں کو ہمیشہ کے لیے موت کی نیند سلا دیا۔ میں کہتا ہوں کیا وہ ملک کے اور مزید حصے نہیں کر سکتے تھے۔ کیا ہمارے وزیروں اور لیڈروں نے اپنے پیٹ کاٹ کر اور پیدل دورے کر کے ہماری ناک دوسرے ممالک کے سامنے نیچی نہیں کی۔ انھوں نے اپنی تنخواہیں اور الاؤنس کٹوا کٹوا کر کیا ہماری دل آزاری نہیں کی۔ کیا اب بھی وہ ہمارے نمائندے رہ گئے۔ کیا وہ رشوتیں نہیں لے سکتے تھے، کیا وہ اپنی تنخواہیں نہیں بڑھا سکتے تھے۔ کیا ایسا کرتے انھیں شرم محسوس ہوتی تھی۔ کیا اسی دن کے لیے وہ ہم سے ووٹ مانگنے آئے تھے؟ کیا حکومت نے چوریوں، ڈاکوں اور بے ایمانیوں کو ختم کر کے جیل، پولیس اور عدالتوں کو مفلوج نہیں کر دیا، کیا جنگ نہ کرنے کے معاہدے نے ہماری فوجوں کو بے کار نہیں کیا، کیا فوجوں کا یہی کام ہے کہ وہ گھاس کاٹیں اور بجائے ٹینک کے ٹریکٹر چلائیں۔ کیا ان حالات کے ہوتے ہوئے بھی حکومت سمجھتی ہے کہ غدر نہ ہوتا، کیا یہ حالات غدر کرنے کے لیے کم تھے، کیا حکومت کو غدر کروانے کے لیے آسمان سے کسی قیامت کے نازل ہونے کا انتظار تھا؟"

تقریر کرتے کرتے بنگل پانڈے شدت جذبات سے مغلوب ہو کر دم لینے کے لیے بیٹھ گیا۔ تماشائیوں میں بنگل پانڈے کی جے جے کار ہونے لگی اور مارشل نے "آڈر آڈر" کی اپیل کے بعد حکم دیا۔

"چڑھا دو سولی پر اس باغی اور غدار کو ـــــ ہم اس کے لیے پھانسی کی سزا تجویز کرتے ہیں اور حکم دیتے ہیں کہ بقیہ باغیوں پر مقدمہ اگلی پیشی میں بند

کمرے میں چلایا جائے، ورنہ خطرہ ہے کہ دوبارہ یہ بغاوت کی چنگاریاں بھڑک کر شعلوں میں نہ تبدیل ہو جائیں — "مارشل کے اس حکم اور رجیوری کے اتفاق رائے سے امر شہید منگل پانڈے کو سولی چڑھا دیا گیا۔ پھر نہ پتہ چلا کہ بقیہ باغی سرداروں کو زمین کھا گئی یا آسمان — اب غدر کے چرچے رہ گئے ہیں — تاریخ کے تسلسل کو برقرار رکھنے کے لیے ہمیں غدر کے بارے میں صرف اتنا ہی مواد ملتا ہے۔

www.taemeernews.com

کپور
ایک تحقیقی و تنقیدی مطالعہ

جو ادیب طنز نگار ہیں ان میں سے ایک آدھ سے مجھے بار بار ملنے کی خواہش ہوتی ہے۔ ان میں سے یہ حضرت کپور بھی ہیں۔ کپور کی گرفت مجھ پر اس وجہ سے ہے کہ وہ ایک مزاح نگار، ایک طنز نگار ہیں اور اس کے باوجود ایسے ہیں جیسے کہ عام طور پر ہم اور آپ ہوتے ہیں۔ تنقید میں لوگ کبھی انھیں اچھا کہتے ہیں، کبھی برا۔ مجھے یہ دونوں باتیں ناپسند ہیں۔ آرڈی نینس کسے پسند ہوتے ہیں۔ الٹی چیز سیدھی یا سیدھی چیز الٹی نظر آئے تو کوئی تعجب کی بات نہیں مگر حیرت ضرور ہوتی ہے کیوں کہ طنز کا تقاضہ ہے کہ وہ یک رنگی میں ظرافت اور ظرافت میں یک رنگی پیدا کرے۔ اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ اردو ادب نے ہم کو کیا دیا تو میں تین نام لوں گا۔ غالبؔ، اقبالؔ اور کپورؔ۔ غالبؔ اور اقبالؔ کی خطا اس وقت معاف کیجیے اور کپورؔ کی بات کیجیے۔ جو طنز نگار اپنے قاری کو اپنا ہمراز و دم ساز نہ بنا سکے وہ طنز نگار نہیں، مولوی یا لیڈر ہوگا! خود جل کر دوسروں کو ہنساتے ہیں۔ کڑھنا اور ہنسانا وہ امتیاز ہے جو ان کے سوا کہیں نظر نہیں آتا زمانے نے طنز نگاروں کے ساتھ کبھی اچھا سلوک نہیں کیا۔ اس لیے کہ طنز نگار خود زمانے کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتے۔ یہ بات ہمیشہ بھول جانی چاہیے۔ طنز نگاروں پر کبھی بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔ مجھے یہاں وہ باتیں ثابت نہیں کرنی ہیں جو ابھی ابھی کہی گئی ہیں

ان کے بہت سے مضامین ایسے ہیں جن پر خون خرابہ ہو سکتا ہے، خون زیادہ خرابہ کم، ایسے ہی مضامین پر میں سر دھنا کرتا ہوں، یہی تاثیر دلیری اور دلبری دونوں کا باعث ہوتی ہے۔ ان کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے طنز کو ہمارا کلچر اور ہمارے کلچر کو طنز بنا دیا۔ طنزیات و مضحکات میں طنز کا یہ "تصرف دوام" مبارک سمجھا جائے یا نہیں، حیرت انگیز ضرور ہے۔ انھوں نے طنز کی وضاحت کی ہے امامت کا دعویٰ نہیں کیا ہے۔ یہ وہی طنز نگار کر سکتا ہے جس کی گرفت زندگی پر ہو نہ کہ وہ جو زندگی یا طنز نگاری کی گرفت میں ہو۔ اس گرفت میں کپور ایسے آئے جیسے فلمی گانوں کے درمیان اور دوران میں پکے گانوں کا کوئی استاد وارد ہو جائے۔ کپور دو اور دو پانچ مانتے ہیں، ریاضی سے یہ لگاؤ دوسروں کو ناگوار ہو تو ہو، مجھے گوارہ ہے۔"

(بہ طرز پروفیسر رشید احمد صدیقی)

"کپور کی طنز نگاری ہمارے ادب کے تہذیبی سرمائے کے اُس سماجی اظہار سے منسلک ہے جو معاشی و معاشرتی حالات اور میکانکی قوت نقد کے ارتقاء کی جد وجہد، تخلیقی عمل اور جمود کے سماجی ٹکراؤ سے انفرادی پسندیدگی کی صورت میں برآمد ہوتا ہے۔ اس کا عمرانی مفہوم میرے نقطۂ نظر کے فلسفیانہ ربط اور اشتراکی حقیقت نگاری کی طبقاتی کش مکش کے اجتماعی شعور میں عام ہے۔ یہ ریاضیاتی تناسب اور مابعد الطبیعات کے لاشعوری تضاد کے بعد المشرقین میں مل جائے گی۔ کبھی کبھی یہ بعد المغربین کی نامیاتی صورت میں بھی ظاہر ہوتی ہے۔ مگر اجتماع ضدّین مارکسی نقطۂ نظر سے قطعی غیر منطقی ہے کیوں کہ اس کے مثبت و منفی اثرات اپنے سطحی مفہوم کی توضیح کے لیے مروّجہ عصری روایات کی مادّیت، ہیئت، اور مواد کی گتھیوں میں الجھ کر رہ جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی تاریخی جبریت کی عینیت پرستی جو ادب برائے زندگی کی ترویج میں زمان و مکان کو اپنی گرفت میں لا کر رجعت پرستی کا تاریخی تجزیہ کرتی ہے، تاریخی مادّیت کے سماجی محرکات کی سطحی خارجیت کی داخلی کثافتوں سے آلودہ ہو کر اپنے مبہم مفہوم میں سماجی ڈھانچے کو پیش

www.taemeernews.com

کرتی ہے۔ کپور کی واقعیت کا جامد تصور ان کے مزاحیہ نصب العین کی توجیہہ کر دیتا ہے۔ طنز و ظرافت کی یہی مادّی کش مکش سماجی نظام کی حکمیانہ پروڈی پیش کرتی ہے۔ اس سے سماجی پیچیدگیوں کے مافوق الفطرت مسائل پر روشنی پڑتی ہے۔ اور بین الاقوامی بورژوا سماج کے مخصوص فلسفۂ حیات کی ذہنی کش مکش پرولتاری طبقے کے طبقاتی شعور کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ حاکم اور محکوم کی یہ کش مکش ان کے طنز کا نشانہ ہے۔"

(بہ طرز پروفیسر احتشام حسین)

"اردو میں طنز کا وجود محض فرضی ہے۔ یہ صفر کا نقطہ خیال ہے۔ یا زیرے کی موہوم کمر۔ اس طرز کے طنز اور صحیح ظرافت میں فرقِ مشرقین ہے۔ یہ فرق یہاں کم معلوم ہوتا ہے۔ مگر دوسروں کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ ہے۔ یہ دل چسپ ضرور ہے لیکن اسے ظرافت سے کوئی خاص لگاؤ نہیں۔ اس کے پیش کرنے سے طنز و ظرافت کی اہمت میں اضافہ ممکن نہیں۔ اس لحاظ سے یہ اوروں پر فوقیت رکھتا ہے، دنیائے طنز میں اس کی وہی اہمیت ہے جس کی حامل پطرس کی ظرافت ہے، یہ گویا مزاح کا بلند ترین نقطہ ہے اس سے آگے فکر کی رسائی نہیں، اس محدود طاقت پرواز کا ہونا نہ ہونا برابر ہے، تفصیل کی یہاں نہ گنجائش ہے نہ ضرورت، نہ وقت، غالباً یہ پطرس کو دیکھ کر میدان میں آئے، مگر افسوس کہ ان میں پطرس کے محدود اوصاف کا بھی مطلق پتہ نہیں، ان کی کتابوں کے دیباچے پڑھنا گویا جہاد کرنا ہے۔ لیکن اس جہاد سے بھی کوئی دینی یا دنیوی فائدہ متصور نہیں۔ کیوں کہ ان کے خیالات ماخوذ، واقفیت محدود، نظر سطحی، تخئیل ادنیٰ، علمیت غائب، شخصیت اوسط، املا غلط، انشا غلط، برخود غلط، پھر کورانہ تقلید میں مثلِ آفتاب روشن، اس کا خیال بھی نہیں ہوتا کہ ان سے اور روح طنز سے کوئی لگاؤ بھی ہے۔ نظر حسب معمول جسم پر ہے، دوسرے کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ ان

کی عینک مانگے کی ہے۔ آواز اپنی نہیں محض ایک صدائے بازگشت ہے۔ یہ آواز اردو طنز کی تکمیل ہے۔ یہاں جو کچھ لکھا جائے گا اس سے ان کی تحقیر مقصود نہیں، ان کی اہمیت اپنی جگہ پر مسلم ہے۔ یہاں صرف اتنا کہنا کافی ہوگا کہ ان کی نظر سطحی ہے۔ اسی وجہ سے ان کے قاری کو ذہنی جمناسٹک کی ضرورت پڑتی ہے، مگر ان تمام باتوں کے باوجود کسی نے اب تک "نرم گرم" سے بہتر کارنامہ پیش نہیں کیا، یہ خیال کہ "نرم گرم" اردو میں طنز و ظرافت کا بہترین کارنامہ ہے نہایت حوصلہ شکن ہے۔ جس کو یہ طنز کہتے ہیں اس کا ظرافت سے دور کا لگاؤ بھی نہیں ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ طنز و ظرافت کے بیچ میں معلق ہیں، ان کی اہمیت باوجود قابل قدر اضافوں کے بہت زیادہ نہیں، ان کی وقعت مشاعروں کے سجان اللہ سے زیادہ نہیں۔ اس کا سبب ان کی مزاحیہ کج روی کے سوا کچھ نہیں، ان کی حیثیت ایک ایسے طالبِ علم کی ایسی ہے جن کی شخصیت ایسی ہے جیسی کہ عام طور پر شخصیت ہوا کرتی ہے جو ان کی قوتِ ایجاد کی کمی ظاہر کرتی ہے۔ ان کے مضامین پڑھنے کے لیے ایک عمر چاہیے۔ یہ ایک طالب علم کے کارنامے ہیں جو قابل رشک ہیں۔ یہ مضامین اتنے شگفتہ و دل بہار ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ مصنف اس کا اہل نہیں کیوں کہ یہ عمر طبعی پر پہنچنے سے قبل ہی مصنف بن بیٹھے یہ مضامین اسی عجلت اور کم سنی کا نتیجہ ہیں۔ اس سے ان کی مزاحیہ بوکھلاہٹ کا پتہ چلتا ہے۔ اس قسم کی بوکھلاہٹ مصنف کو دلیر بنا دیتی ہے۔ اور وہ ایسی حرکتیں کر بیٹھتا ہے جس سے فرشتے لرزتے ہیں اور نقاد قلم اٹھاتے ہیں۔"

(یہ طرز پروفیسر کلیم الدین احمد)

"مجھے — یہ — کہنا ہے — کہ — کپور — کے مضامین میں جو وہ لکھتے ہیں وہ مضامین اور ان کے دوسرے مضامین جو طنزیہ و مزاحیہ ہوتے ہیں، ان مضامین میں میرے خیال میں جہاں تک میں نے ان کا تنقیدی تجزیہ

کیا ہے اور میں جن نتائج پر بالترتیب پہنچا ہوں اُن سے صرف ایک ہی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ مضامین اپنی جگہ پر ایسے مضامین ہیں جن میں میری دانست میں طنز ہے یعنی ان مضامین میں طنز ہے ۔ طنز ۔ میں یہ کہتا ہوں کہ ان مضامین میں اپنی جگہ پر جیسا کہ لکھ چکا ہوں طنز ہے ۔ ایسا طنز جو سودا، غالب، اکبر، رشید احمد صدیقی، فرحت اللہ بیگ، پطرس، شوکت تھانوی، سعید محمد جعفری، شفیق الرحمٰن، غلام احمد، فرقت اور کنہیالال کپور کے یہاں پایا جاتا ہے اور جس کی بے شمار مثالیں مغربی ادب سے پیش کی جا سکتی ہیں ۔ مثلاً پوپ، سوئفٹ لیوکاک، مارک ٹوئن وغیرہ کے یہاں جا بجا آپ کو ملے گا۔ اور قدم قدم پر ملے گا' یہی وہ طنز ہے جس سے کپور اپنے مضامین میں طنز کا احاطہ کرتے ہیں ۔ یعنی اپنے مضامین میں طنز کو جگہ دیتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے یہاں طنز آجاتا ہے ۔ دوسرے معنوں میں یوں سمجھیے کہ پیدا ہو جاتا ہے ۔ ایسا طنز جو دیکھنے میں عام طور پر طنز معلوم ہو اور جو کہ اپنی جگہ پر سوائے طنز کے اور کچھ نہ ہو ۔ یہ بڑی اچھی بات ہے اور ہر جگہ اس بات کا ہونا مشکل ہے ۔ مگر پھر بھی انھوں نے اس مشکل کو بخوبی نبھا دیا ہے، نبھانا بھی ایک آرٹ ہے اور اس آرٹ میں مجھے ـــــ طنز ملتا ہے طنز ۔ لہٰذا اس سے یہ بات بخوبی واضح، ثابت اور روشن اور صاف ہو جاتی ہے کہ ان کے یہاں قاری کے علاوہ ناقد کو بھی بہ آسانی طنز دستیاب ہو جاتا ہے ۔ اس طنز کو جو ان کے یہاں ہے ہم سوائے طنز کے اور بھلا کہہ بھی کیا سکتے ہیں جو کہ طنز ہے یعنی طنز ہی ہے ۔ اگر کچھ اور ہوتا تو بھی طنز ہوتا ۔ طنز کا ہونا اس امر کی دلیل اور کلی شہادت ہے کہ ان مضامین میں ہم کو طنز مل جاتا ہے ۔ ابھی میں نے دلائل و شواہد سے اس بات کو واضح کیا ہے کہ طنز نگار کپور کے یہاں مجھے طنز ملتا ہے ۔ جس میں ظرافت کی چاشنی، مغرب کے اثر سے آتی ہے اور بجنسہ موجود ہے جس کی وجہ سے میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ ان کے یہاں جو چیز ہے وہ سوائے طنز کے اور کچھ نہیں ہو سکتی ۔ میرا دل گواہی دیتا ہے

www.taemeernews.com

کہ یہ طنز ہے۔ یہ موقع تفصیل میں جانے اور بحث کو طول دینے کا نہیں، اس لیے
مختصراً عرض کرتا ہوں کہ ان کے یہاں طنز ہے جس کے لیے قسم خدا کی میں اب حلف
اٹھانے تک کو تیار ہوں کہ ان کے یہاں طنز ہے۔"

(بہ طرز ڈاکٹر عبادت بریلوی)

"اس مخطوطے کو اختلاط طباعت کی کثرت کی وجہ سے کالعدم سمجھا جائے
اس لیے میں اس سے استشہاد نہیں کروں گا، اقتباس بالا ص۹۲ سطر ۲ خط جو میں
نے اپنی خوش دامن کو تحریر کیا تھا۔ حاشیہ نمبر ۲ مجھے بانکی پور لائبریری میں ایک مخطوطہ
بوسیدہ اور سقیم حالت میں کبوتر کے مضامین کا مل گیا ہے۔ خاندان میں جملہ پرسانِ حال
کو اس کی خوش خبری پہنچا دو کہ فی زمانہ اس سے جہاد میں مصروف ہوں۔ اندازہ ہے
کہ اس کا تعلق بیسویں صدی کے نصف آخر سے ہے "جزئی باتوں سے قطع نظر ۱۲
کتابوں کے ع ۲، دفتروں میں ایک نسخہ اور بھی ناقص مقدمہ ۱۰/۱ نہ ہونے کے برابر ہے۔
اگر اس کو تسلیم نہ کیا جائے تو مصنف کے ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حاشیہ
"دھوبی کی کاپی" صفحہ سطر ۵ باوجودیکہ مضامین طنزیہ ہیں اور ظرافت کے باب میں اضافہ
کر سکتے ہیں مگر افسوس ہے کہ ان میں جا بجا مصدر کی علامتیں واضح نہیں کی گئی ہیں۔
صفت مشتبہ حالت میں ملتی ہے، کتاب میں صرف ایک بار ان کا استعمال ملتا ہے
اس سے مراد غالباً کاتب ہے۔ جس کو شارحین نے کتابت کا غلط مطلب اخذ کر کے
نہ جانے کیا قرار دے دیا ہے (ج چ ع ۱۱) صحت سے بعید ہے، یہ نسخہ بیسویں
صدی سے متعلق ہے۔ (ج۔غ ۵/۳) جہاں تک میرا علم ہے یہ مضامین نصاب
میں داخل کرنے کے لیے لکھے گئے ہیں۔ "ہنگامۂ تحریر" نسخۂ تبریزی مطبوعہ النظر
جلد ہشتم ع ۱۱ حوالہ بلا سند کے ہے اس وجہ سے اسے مسترد سمجھا جائے۔ یہ مسئلہ
مابہ النزاع ہے کیوں کہ کسی مستند فرہنگ میں اس کا حوالہ نہیں ملتا۔ یہ مہملات کا
ایک نادر مجموعہ ہے جو ۲۲ × ۱۲ فٹ کے ۶۶۲ رم صفحات پر مشتمل ہے ۱۷۰ سطر فی صفحہ

www.taemeernews.com

اب بھی مل جاتے ہیں۔ مگر نایاب ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک خط کا اقتباس قابل توجہ
ہے۔ "میرا خط میرے نام"۔ رسائل میں شائع کروانے کی غرض سے تحریر کیا گیا
تھا۔ اب تک کئی سال ناموں میں معمولی سی ردو بدل و ترمیم کے ساتھ شائع ہو
چکا ہے۔ حافظے کے لیے ملاحظہ ہو رسالہ "نرالی دنیا" "الٹی دنیا" "سیدھی دنیا"
اور "ہنگامی دنیا" اس کے بعد چھپنے کی نوبت نہیں آئی۔ کیوں کہ ہنگامہ ہو گیا تھا
گو کہ میرے اعتراضات سنگین اور صحیح ہیں۔ ملاحظہ ہو۔ "گھریلو جھگڑے ص۱۲۳۔ موٹر
گائیڈ ص۱۲۔ کرامات اُلّو عرف کالا جادو یعنی ساجن موہنی ص۲۲ اصولی بحث میں یہاں
صرف چند اعتراضات پر اکتفا کروں گا۔ مثلاً کتاب کے صفحہ ۳۴ سطر ۲۱ میں "لا" کا
غلط استعمال کیا گیا ہے جس کے لیے مصنف کی تنبیہ ضروری ہے اور ہماری بحث
سے خارج ہے، کیوں کہ اس کو معاف کرنے پر بھی اعتراض ہرگز رفع نہ ہوگا۔
پھر سند تو قطعی غلط ہے، حروف تہجی کی ترتیب سرے سے غلط ہے۔ ابجد کے
لحاظ سے کتاب کا پہلا لفظ الف سے شروع کرنے کے بجائے یے سے شروع
کیا گیا ہے۔ مصنف سخت تنقید کا مستحق ہے۔ ۹، ۸، ۷، ۶، ۵، ۴، ۳، ۲، ۱، اس بات
کو معترض الیہ کی جانب ہرگز نہ منسوب ہونا چاہیے۔ اس کے مایوس کن رویہ سے
برانگیختہ ہو کر فحش دشنام سے کام لینا یہ بھی ایک کام ہوگا۔ اس قسم کے کاموں کی
سخت ضرورت ہے۔ جن تحقیق کے شہ سواروں نے اس نسخے پر اب تک بھروسہ
کیا، ان کے ساتھ تنبیہی کارروائی کا ہونا سخت ضروری ہے۔ الفاظ سے جا بجا
مترشح ہوتا ہے کہ سہو کا "زنّار" دار رکھا گیا ہے۔ الف... ب پ ت ٹ ث، ج
چ ح خ، د ڈ ذ، ر ڑ ز، س ش، ص ض، ط ظ، ع غ، ف، ق، ک، گ، ل، م، ن،
و، ء، لا، ھ، ی، یے، ص۸ ص۹ ص۱۰ ص۱۱ ص۱۲ مثلاً ج کی جگہ ح کا استعمال کم
از کم ۷ جگہ صریحاً کیا گیا ہے جس کا نہ تو مزاح سے کوئی تعلق ہے اور نہ کاتب سے۔
یہ کھلا ہوا طنز ہے۔ رسالہ طمزعہ ص۲۵ ص۲۴ ص۲۳ ص۲۲ فتح میں، د، اور "ط" نیک
الفحت، فی الی تحت، الفتحہ کا مصدر مفارعی سکوت کی حالت میں ملتا ہے۔

www.taemeernews.com

مزاح میں مرثیہ کی کیفیت کی ذمہ داری اسی لا ابالی پن پر ہے۔ ۲۵ء ۲۵ لفظ کی تصغیر میں بامعنی لفظ کثیر الاستعمال محتاج ثبوت و سند کے اعتبار سے خبط کرنے کے لائق ہیں۔ فقرات نثر جا بجا نسخے میں ملتے ہیں جو قطعاً نامعتبر ہیں عبارت ذیل کے نکتے اس سلسلے میں حوالے کے بعد بھی فراموش نہیں کیے جا سکتے، کیوں کہ

ء ء ء ء ء ء ء ء ء ء ء ء ء ء ء پس جس سے ثابت ہو جاتا ہے کہ اس نسخے کا تعلق بیسویں صدی سے ہرگز نہیں بلکہ اٹھارہویں صدی سے ہے۔ اور مصنف مرد نہیں کوئی خاتون ہیں جن کی اردو دانی میں ہمیں شبہ ہے ء ء ء ء ء ء ء ء ء ء ء ء ء ء ء ء ء ء ء عروس ضمنتیں بہ صفحہ اول و صفحہ ثانی میں جا بجا اشتباہ ہے۔ پھر یہ کہ کرۂ ہمزہ بحذف الف لغو اور سراسر مہمل و نامستعمل، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خاتون جن کو ہم کپور کے نام سے فی الحال فرض کیے لیتے ہیں ان کے لیے 'سہو طبعی بود' کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے ۲ء، ۲۲ء، ۳۲ء، ۴۲ء، ۵۲ء، ۶۲ء، ۶۵ء، ۵۸ء، ۵۹ء، ۵۷ء، ۵۶ء، ۵۵ء، ۵۴ء، ۵۳ء، ۵۲ء، ۵۰ء — — — — — — — — — ان طنزیات میں 'ش' کے ساتھ محترمہ 'خ' بھی آئی ہیں اور 'ب' کے ساتھ 'پ' بھی۔ مگر افسوس کہ 'ت' کے ساتھ 'ٹ' نہیں ہے ورنہ ان طنزیات کی کچھ اور ہی شان پیدا ہو جاتی۔ ہائے ہوز کی سخت مٹی پلید کی گئی ہے۔ مصنف خود اس میں اپنے طنز کا نشانہ بن گیا ہے۔ حائے حطی کی ٹھونسم ٹھانس سے طبیعت میں ایک قسم کا بھاری پن اور گراوٹ محسوس ہوتی ہے، طنز سطحی ہو کر رہ جاتا ہے۔ دو چشمی ہے اور ہمزہ کے ساتھ بے توجہی کھٹکتی ہے۔ 'واؤ' کا کثرت استعمال کلاسی شان کے خلاف ہے۔ اس کو روایت سے بغاوت متصور کیا جائے گا۔

مخترعات مصنوعی جو منافقوں نے بعد میں بطور حاشیہ پیش کیے ہیں، جمع حاضر، واحد متکلم غائب کے صیغے میں چند کا استعمال نہایت بے باکی سے کیا گیا ہے مگر اس سے محترمہ کا احمق ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ مگر یہ سند

ہے کہ بیسویں صدی میں چند سنجیدہ مضمون میں بلاتکلف استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ لفظ غریب نہیں تھا بلکہ سماج میں اس کی اہمیت تھی۔ مگر اس سے غلط فہمی پیدا ہو جانے کا خطرہ ہے۔ اس کے لیے کوئی مستند لطیفہ پیش کیا جانا چاہیے تھا۔ ضمائر میں مذکر و مؤنث کا التزام نہیں رکھا گیا ہے۔ اس میں مغرب کا اثر صاف جھلکتا ہے۔ ضمیر ء فاعل ء مکل ء صفت ء ء ء ء مصدر ء ء حرف ء مفعول ء ء ء ء ء اس کے بعد یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ زیر نظر مخطوطے میں کیپور نام کا فرد مرد نہیں بلکہ عورت تھی اور طنز نگاروں میں یدِ طولیٰ رکھتی تھی جس کی تاریخی اہمیت اپنی جگہ پر مسلم ہے۔ اس پر مزید تحقیق کی گنجائش باقی رہ جاتی ہے کہ عورت بھی تھی یا نہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

(بہ طرز قاضی عبدالودود)

---

www.taemeernews.com

کتّے کا خط پطرس کے نام

مکرمی!

"کتّے" پڑھنے والوں نے بلند آواز سے پڑھا اور اس خاکسار نے بغور سنا۔ اس دل آزار مضمون سے ہماری قوم میں کافی اشتعال پھیل چکا ہے۔ گزشتہ کئی راتوں ہم اپنی "رات کی نشست" میں اس پر کافی غور و خوض کر چکے ہیں۔

آپ نے ہمیں اس قابل بھی نہیں چھوڑا کہ اب ہم چار بھلے آدمیوں کے سامنے دم اٹھا کر چل سکیں۔ خوب! غالباً سگ نوازی اسی کا نام ہے۔ نہ ہوئے آپ ہمارے پاس ورنہ ضرور آپ کو کاٹ کھاتے۔ ہم گویا آپ کا دیا راتب کھاتے ہیں۔ سوسنیے نہ، اگر اس قسم کے مضامین ہم بھی باندھنا شروع کر دیں تو آپ کا کیا رہ جائے۔

مضمون میں گائے بکری سے ہمارا موازنہ کرتے وقت آپ یہ بھول گئے کہ اس خرافات پر کسی گائے کی نظر اگر بھولے سے بھی پڑ جاتی تو یہ کب کا دفتر را گاؤ خورد ہو چکا ہوتا۔

بندہ پرور ہم آپ کی نظر میں برے سہی مگر ہماری قوم کی بہادری، وفاداری اور جفاکشی تو ضرب المثل ہے۔ ان ہی خوبیوں نے ہم کو اشرف الحیوانات کے مرتبہ تک پہنچا دیا ہے۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ ہماری اصلیت کو فرنگی پہچانے ورنہ آپ حضرات نے ہمیشہ گھر کی مرغی دال برابر سمجھا اور دال کو بھی نظر انداز

www.taemeernews.com

کر بیٹھے۔

اللہ اللہ کیسے کیسے بزرگ ہماری قوم نے پیدا کیے۔ خواجہ سگ پرست کے نام سے کون واقف نہیں۔ وہ ہمارے ہی ایک جلیل القدر بزرگ کی پرستش فرمایا کرتے تھے۔ خواجہ صاحب کا قول تھا کہ "سامنے کا کتا دور کے بھائی سے اچھا ہوتا ہے" مگر موصوف سامنے کے بھائی پر بھی دور کے کتے کو فوقیت دیتے تھے۔ حاتم طائی کی خدمت میں ہمارے ایک بزرگ ہر وقت حاضر رہتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ آخر میں حاتم طائی ان کی خدمت میں حاضر رہنے لگے تھے۔ اب بزرگوں پر بات نکلی تو دور کیوں جائیے اصحاب کہف کی مثال آپ کے سامنے ہے۔ ان کو ہمارے ایک بزرگ اس قدر بھائے کہ قیامت تک خود سے جدا رکھنے پر راضی نہ ہوئے۔ اصحاب کہف نے صرف اسی گراونڈ پر کہ "حق گو کتا ناشکرے آدمی پر بھاری ہوتا ہے" ہمارے بزرگ کی رفاقت پر خدا کا شکر ادا کیا۔ اور یہ واقعہ بہت مشہور ہے کہ لیلیٰ کے کتے سے مجنوں کے ذاتی تعلقات تھے۔ ان کو لیلیٰ کی جدائی گوارا تھی مگر ہمارے بزرگ کی جدائی کی تاب نہ رکھتے تھے۔ چنانچہ حضرت نے عمرِ عزیز کا بیشتر حصہ ان کی دم سے چمٹ کر گزار دیا۔ جن بزرگوں سے آپ کا سابقہ سر راہے اکثر پڑتا ہے وہ ثقہ بزرگ اپنی دم کا لنگوٹ کسے کھرے کھوٹے کی پہچان کے لیے صبح صبح نعرۂ حق بلند کرتے رہتے ہیں اور پیٹ بھر جانے پر بھی آخرت و انجام بخیر کے امکانات پر سوچ بچار کرتے رہتے ہیں۔ جس طرح آپ چاند تک پہنچنے کے مسئلے پر روشنی ڈالتے ہیں اسی طرح یہ حضرات اس بات پر غور کیا کرتے ہیں کہ ہم کتوں کے پر کیوں نہیں ہوتے۔! یہ بالکل دوسرا مسئلہ ہے کہ اس موقع پر آپ ان سے گاڑی بھر راستے کے لیے ضد کریں اور یہ آپ کو کاٹ کھائیں۔

ہماری مقبولیت کے آپ منکر ہوں تو ہوں مگر حق بات یہ ہے کہ دنیا کو اس وقت ہماری سخت ضرورت ہے۔ ساری دنیا کی آنکھیں ہماری قوم پر لگی ہوئی ہیں۔ ابھی کل کی بات ہے میں نے آپ کی قوم کے ایک ممبر کو دعا کرتے پکڑا تھا۔ وہ

www.taemeernews.com

حضرت گڑگڑا رہے تھے "چھوٹا بھائی ہونے سے کتا ہونا گوارا ہے" اس وقت میں نے اندازہ کیا تھا کہ دنیا کس تیزی سے ہمیں اپنانے کے لیے آگے بڑھ رہی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ یہ سب کسی منظم پلان کے تحت ہوتا ہو۔ دور کیوں جائیے روزمرہ کی زندگی میں دیکھیے۔ آج بھی آپ میں کتنے اسی ستمگر حلقۂ دُم کے اسیر ہیں جو بغیر ہمارے اپنی تصویر تو تصویر کارٹون تک نہیں کھنچوا سکتے۔ ہمارے لیے کتنے حسن کے مقابلے اور عالمی نمائش کی جاتی ہیں۔ سیر و شکار، جلوت و خلوت میں بلا ہمارے ہر محفل سونی و تشنہ محسوس کی جاتی ہے۔ مگر اس نسلی امتیاز کے باوجود آج بھی ہماری قوم اعلیٰ ترین خوبیوں کی حامل ہے۔ آج بھی بلا کسی ہتھیار کے ہم ہاتھی اور شیر کو پچھاڑ دیتے ہیں۔ ہم میں کتنے شیر افگن اور شیر شاہ ہیں۔

دشمنوں کو اب ہمارے بھونکنے پر بھی اعتراض ہے۔ اطلاعاً عرض ہے کہ ہم صرف اصولاً بھونکتے ہیں۔ آپ کے یہاں جو مثل مشہور ہے کہ بھونکتے ہوئے کتے کاٹا نہیں کرتے، بجا سہی، لیکن کون جانتا ہے کہ ایک کاٹتا ہوا کتا کب کاٹنا بند کر دے اور بھونکنا شروع کر دے۔ سیدھی سی بات ہے۔ مثال دے کر سمجھانے کی ضرورت نہیں۔ بھئی جس کو بھونکنا ہوگا وہ بھونکے گا اور کتنا بھونکے گا یہ اس کی قوت بھونک پر منحصر ہے۔ وہ کتا ہی کیا جو نہ بھونکے۔ اگر کتا ہوگا تو بھونکے گا ضرور۔ ہم اکثر چلتے وقت بھونکا کرتے ہیں۔ مگر یہ ہمارا محض اسٹائل ہوتا ہے۔ ایسے موقعوں پر اگر ہمارے اوپر اینٹ اور پتھر نہ مارے جائیں تو ہم شاید خود بخود تھک کر خاموش بھی ہو جائیں۔ ورنہ دوسرے حالات میں ہم جھوٹ موٹ کاٹ بھی کھاتے ہیں۔

لیکن ہماری اس بھونک کو اگر آپ مشاعرہ گرم کرنے سے تعبیر (معاف کیجیے گا تعبیر ہمیشہ الٹی ہوتی ہے) کریں تو یہ محض آپ کا خیال ہوگا ورنہ اطمینان رکھیے، ہم میں آپ کو شاعر ملیں گے نہ لیڈر۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ہمارا کوئی فرد صاحب دیوان نہیں پایا گیا۔ ہمارے یہ اجتماع دراصل کھیل کود کے

ہلکے پھلکے ورزشی مظاہرے ہوتے ہیں۔ مگر یہ بھی ہم نے آپ ہی سے سیکھا ہے۔ ابھی حال میں آپ کے ایک جلسہ میں شرکت کرنے اس خیال سے گیا کہ دیکھیں ایسے موقعوں پر آپ لوگ کیا کیا کرتے ہیں۔ پتہ چلا کہ ایسے موقعوں پر آپ لوگ جو دنگل کرتے ہیں اس کو الکشن لڑانا کہتے ہیں۔ الکشن تو کہیں نظر نہیں آیا ہاں اس مار پیٹ کے ہنگامے میں کئی بار پٹتے پٹتے بچا اور وہاں سے اپنی جان بچا کر بھاگا۔

لڑنا بری بات نہیں۔ لڑنے کو تو آخر ہم بھی لڑا ہی کرتے ہیں۔ مگر لڑنے کے لیے ہم نہ اپنے سے کمزور کو تلاش کرتے ہیں نہ لڑائی میں شرکت کرنے کے لیے لڑتے ہیں۔ اپنے حریف کو دیکھ کر ہم غرانے لگتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر اگر کوئی ARGUMENTS پیش کرنے کے بجائے دُم دبا کر چلا جائے یا خاموشی سے ڈائلاگ سننے پر قناعت کرے تو ہم اس پر حملہ نہیں کرتے۔ لڑنے کے وقت ہم صرف لڑتے ہیں مگر نہ ہم لڑائی ختم کرنے کے لیے لڑتے ہیں نہ سبق سکھانے کے لیے. ہم کو لڑنے کے لیے آپ کی طرح مذہب یا امن کا سہارا بھی نہیں لینا پڑتا۔ ہمارا سارا غصہ سوڈے کا ابال ہوتا ہے۔ ذرا دیر کی مہابھارت کے بعد ہمارا دل اور جھگڑا صاف ہو جاتا ہے۔

ہمارے یہ جھگڑے خالص اصلاحی قسم کے ہوا کرتے ہیں۔ مگر واضح ہو کہ ہم لوگ صرف جلسہ کرتے ہیں چندہ کبھی نہیں کرتے۔

ہمارے راتوں کو جاگنے اور دن کو سونے کے بارے میں جو کچھ مشہور ہے اس کو اسی طرح مشہور رہنے دیا جائے۔ اس کے بارے میں کوئی صفائی ہم کو نہیں پیش کرنا ہے۔ دنیا کی تباہی اور انسانوں کی انسانوں سے عصبیت اور کم ظرفی کے باعث ہمیں دن میں آرام سے جاگنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس لیے ہم نے طے کر لیا ہے کہ جب تک انسان، انسان نہ ہو جائے ہم دن کو سویا کریں گے۔ ہم ان کی حرکتوں کو نظر انداز کرنے کے لیے ایسا کرتے ہیں۔ پھر

رات میں جاگ کر ہم اپنے کو قدرے آرام میں محسوس کرتے ہیں۔ اس وقت ہمارا محبوب مشغلہ تاریک راتوں میں چھپ چھپ کر حرکتیں کرنے والے بزدل انسانوں کی دیکھ بھال کرنا ہوتا ہے۔ ایسے میں رات گئے اگر ہم کسی کو آوارہ گردی کرتے دیکھتے ہیں تو بطور احتجاج اسے ٹوک بھی دیتے ہیں۔

ہماری قوم آپ کی نظر میں کچھ بھی سہی، مگر یہ حقیقت ہے کہ ہمارا کوئی ہم جنس کبھی رشوت دیتا یا لیتا ہوا نہیں پکڑا گیا۔ رہی مکان، جائداد کی طرف سے ہماری بے نیازی تو اس کا سبب آپ حضرات کی وہ مشق ستم ہے جو ان مٹی کے گھروندوں کے لیے آپ ایک دوسروں پر فرمایا کرتے ہیں۔ ہم نے کبھی کوئی مذہب یا روزگار اسی سبب سے اختیار نہیں کیا کہ اس میں ہمیں بوئے فساد آتی ہے۔ اور وہ تو کہیے کہ ہم نے مصلحتاً سائنس کی تعلیم پر زور نہیں دیا ورنہ آج بلا تکلف ایٹم بم کی ایجاد ہمارے سر تھوپی جا چکی ہوتی۔

عورتوں کے حقوق آپ ہم سے مستعار لے سکتے ہیں۔ اس بیسویں صدی میں بھی ہمارے یہاں اس قدر مساوات ہے کہ اگر ہم ایک دفعہ اپنی بیگم صاحبہ پر بھونکنے کا ارادہ بھی کریں تو وہ ہم کو اس درمیان میں تین چار مرتبہ کاٹ کھائیں یا اس وقت تک لگاتار بھونکتی رہیں جب تک کہ ہم اپنا ارادہ POST PONE نہ کر دیں۔

ہمارے یہاں ہر چیز کا ایک نام ہوتا ہے۔ اس کے آگے ہم لفظ "اصلی" کا اضافہ اس وجہ سے نہیں کرتے کہ وہ لفظ بذات خود اصلیت ہوتا ہے۔ اگر آپ ہمارے یہاں جھوٹ، تصنع، بدکرداری، بلیک مارکیٹ کے قسم کی چیز کھانے کے خیال سے بھی ڈھونڈھیں تو آپ کو سخت مایوسی ہوگی۔

ہماری قوم سیاست اور لیڈر دونوں کو شک کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور ان سے دور رہتی ہے۔ ہم نے آپ کی نام نہاد تعلیم پر اپنی جہالت کو عزیز رکھا مگر عزیز داری سے ہمیشہ دور بھاگے۔ دولت اور غربت پر اپنی

حیثیت خاموش تماشائی کی جانی۔ اب آپ ہی انصاف کیجیے کہ جس قوم کے پاس لاٹھی اور بھینس دونوں ہی مفقود ہوں۔ جو قوم شاعر، لیڈر اور سیاست دانوں سے یکسر خالی ہو آپ اس کو خراب کہاں سے کہہ سکتے ہیں۔ جن کے آدرش اتنے بلند ہوں کہ وہ "زندہ رہو اور زندہ رہنے دو" کے لیے دن رات بھونکتے رہتے ہوں ان کو آپ انسانوں پر فوقیت کیوں نہیں دے سکتے؟

میرے خیال میں خط بہت طویل ہوا جاتا ہے۔ مگر اس کو ختم کرنے سے قبل آپ کی توجہ ایک بات کی طرف دلا دوں۔ بات تو خواب و خیال کی ہے کہ خواب میں آپ کو کتے ہی کتے نظر آتے ہیں۔ اگر ہم میں سے کسی کو بھاگتے میں انسان نظر آجائیں تو اس کو پاگل تصور کیا جاتا ہے اور حتی الامکان اس سے بچنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

امید ہے، آپ تھوڑے کو بہت اور خط کو تار سمجھیں گے اور دوسروں کے دامن کو تار تار کرنے کی آئندہ کوشش نہ کریں گے۔ معلوم نہیں آپ میرے خیال سے متفق ہوں گے یا نہیں لیکن اتنا ضرور چاہوں گا کہ دوران خط و کتابت اگر آپ اختلاف بھی کریں تو علمی انداز سے۔ اس سے مجھے بھی فائدہ ہوگا۔ فقط

آپ کا مخلص
"ایک کتا"

---

www.taemeernews.com

شرافت کی تلاش میں

کسی دور دراز ملک کی ایک خفیہ تجربہ گاہ میں ماہرین مسمریزم دنیا کا ایک اہم ترین تجربہ کر رہے تھے۔ دراصل قدیم چٹانوں میں ملنے والی بیسویں صدی کی تحریروں سے انکشاف ہوا کہ اس زمانہ میں ایک شے پائی جاتی تھی جسے "شرافت" کہتے تھے جو مرکب تھی "شر" اور "آفت" کا۔ جس کے برتنے والے ہر قسم کے "شر" جھیلتے اور "آفتوں" کا سامنا کرتے۔ یہاں تک کہ ان شرافت کے پتلوں پر آفت کے پرکالے غالب آگئے۔ انھوں نے شرافت کے سارے مجسمے دفن کر دیے۔ شرافت کے جو ڈھانچے قدیم چٹانوں میں ملے ان کا تعلق چھٹی اور ساتویں صدی سے ہے۔ ان کے کیمیائی تجزیے سے حیرت انگیز حقائق سامنے آئے۔ مثلاً ان میں ساتویں حس بھی ہوتی تھی جسے انسانیت کہتے جس کے تحت یہ دوسروں کے دکھ درد اور آڑے وقتوں تک میں کام آتے۔ بلاکسی صلے کے دوسروں کی پرورش اور امداد کرتے۔ دودھ پلانے والی اس مخلوق کے پائے جانے والے ڈھانچوں میں سب سے بڑا ڈھانچہ حاتم طائی کا ہے۔ یہ نسلی، علاقائی، مذہبی تعصب اور عملی زندگی کے دوسرے مقبول عام نظریوں سے عاری تھے۔ ظاہر و باطن یکساں ہونے کی وجہ سے یہ بے حد سپاٹ اور کھردرے ہوتے اور محض اکہری شخصیت کے مالک ہو پاتے۔

ان ڈھانچوں کے مطالعے سے پچھلی شرافت کے جو نمونے ملے وہ انواع

www.taemeernews.com

واقسام کے ہیں مگر ان سب کا احاطہ انسانی شرافت کرلیتی ہے۔

پتہ یہ لگانا تھا کہ فی زمانہ دنیا میں شرافت پائے جانے کا کوئی بھی امکان ہے؟ اگر ہے تو کتنے فی صد؟

اس پروجیکٹ پر کام کرنے کے لیے ہم نے امیر، غریب، ڈاکٹر، نقاد، اسمگلر، پولیس، اینٹی کرپشن، دانش ور، صحافی، سیاست داں، جرائم پیشہ، سائنس داں، باغی اور سیدھے اور ٹیڑھے سماج کے نمائندے منتخب کیے۔

ہمارا طریقہ کار سیدھا سادا تھا۔ نہ تو اعداد و شمار جمع کرنے یا زبانی جمع خرچ کا بندھا ٹکا بھتّے بنانے والا انداز تھا، نہ ہم فائلیں چلاتے، نہ ٹی وی، ریڈیو، اخباروں اور رسالوں میں دھومیں مچا کر ہوا باندھتے۔

ہمارا ادارہ بہ ظاہر نفسیاتی علاج کا بین الاقوامی مرکز تھا جس میں پیچیدہ، خود غرض مشینی زندگی کے پیدا کردہ میکانکی امراض کا شرطیہ علاج ہوتا تھا۔ جس کا تجزیہ کرنا ہوتا اس کو کسی تقریب کے بہانے بلا کر مہمان رکھتے اور سوتے میں مسمرائز کر کے اس کی روح سے سوال و جواب ٹیپ کر لیتے۔

سب سے پہلے ہم نے ایک انکل سام ٹائپ کے امریکی سیاست داں کا پوسٹ مارٹم کیا۔ جو زیرِ بے تدبیر تھا اور بے خبر سو رہا تھا۔ اس کی روح سے سوال و جواب کی تمام کوششیں رائگاں گئیں کیوں کہ وہ اوپر سے زیرو تھا اور اندر سے سی۔ آئی۔ اے ایجینٹ۔ اسی لیے اس کے سر سے کوئی روح ہی نہ تھی مجبوراً ہم نے بے روح سیاست داں کو جگا کر چلتا کیا۔

انتہائی ٹیڑھے انسان کی روح بھیڑ سے بھی زیادہ سیدھی نکلی۔ اس میں شرافت کے کچھ کچھ آثار پائے گئے۔ یہی عمل ہم نے ایک دانش ور پر دہرایا اس کی روح تو نکلی لیکن بے حد مریل۔ اس نے کہا

"بلا شرافت کے تو حال پتلا ہے۔ اگر اسے بھی شاملِ حال کر لیں تو نہ صرف ٹکے کے تین تین ہو جائیں بلکہ جان تک کر لالے پڑ جائیں۔"

www.taemeernews.com

ایک غیر ملکی جرائم پیشہ کی روح سے پوچھا "تم جرائم پیشہ کیسے ہوگئیں؟"
اس نے کہا "شرافت سے رہنے کا پیاری پولیس نے موقع ہی کہاں دیا؟ دن رات وہی مقدموں میں پھانسا، گواہیاں دلوانا۔ کسی غریب کو دنیا نے شرافت سے رہنے دیا ہے؟ یا شریف مانا ہے؟ آپ ہمارے ملک میں جتنے زیادہ جرائم کرتے رہیں اتنے ہی سربلند رہیں گے۔ میں نے جھوٹ سے بھاگنا چاہا۔ مجھے جیل میں بند کر دیا گیا۔ میں نے بدعنوانیوں کے خلاف آواز بلند کرنا چاہی میرا گلا گھونٹ دیا گیا۔ میں نے جرائم کا راستہ اپنایا، مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا!"

"تم نے قانون کا سہارا کیوں نہ لیا؟"

"میں شرافت کو بطور لبادہ استعمال کرنے کی قائل نہیں۔ قانون اور حکومتیں آپ کا سب کچھ چھین سکتی ہیں مگر کچھ دے نہیں سکتیں" جرائم پیشہ کی روح اپنی گم شدہ شرافت پر آنسو بہانے لگی۔

اگلی روح ایک انتہائی امیر و کبیر انسان کی تھی۔ اس نے انتہائی حیرت سے پوچھا "شرافت؟ .... شرافت کس چڑیا کا نام ہے؟ ہمارے سمجھانے کے باوجود اس کے ذہن میں شرافت کا کوئی تصور تک نہ آ سکا۔ اس نے دماغ پر انتہائی زور دیتے کہا "اچھا! اچھا سمجھ گیا۔ شرافت سے آپ کی مراد مزدور کا پیسہ، غریب کی عزت، نادار کی عصمت، قانون و انصاف، آرام و آسائش، نام و نمود، عزت و شہرت ہے۔ او ویری گڈ! یہ تمام چیزیں اپنے استعمال کے لیے ہم دو نمبر کے ہیرے جواہرات، سونے چاندی اور روپے پیسے سے بافراط خریدتے ہیں۔ اسی کو ہماری شرافت سمجھ لیجیے!"

ہم نے سرحد پار اینٹی کرپشن کی روح بیدار کرنے کی کوشش کی۔ وہ بولی۔ "مجھے آرام کرنے دیجیے۔ میں قطعی اینٹی نہیں ہوں۔ اگر میں نہ رہوں

www.taemeernews.com

تو لوگ کرپشن کو ترس جائیں"

ڈاکٹر کی روح بولی " ہماری شرافت اصلی مرض کے نقلی علاج میں پوشیدہ ہے۔ دنیا ہمیں دعائیں دیتی ہے۔ ہم اس کی روح قبض کرتے ہیں"

اسمگلر کی روح نے پوچھا " شرافت کو کہاں سے اسمگل کیا جا سکتا ہے

سائنس داں کی روح نے کہا " ایٹمی جنگ ہو جانے دیجیے۔ اس کے بعد دنیا میں سوائے شرافت کے کچھ باقی نہ رہ جائے گا"

ناقد کی روح نے کہا " شرافت سے تو میرا نظریاتی اختلاف ہے"

محقق کی روح نے بہت غور و فکر کے بعد بتایا کہ " شرافت ایک تحقیق طلب مسئلہ ہے"

صحافی کی روح نے کہا " اگر آپ مجھے شرافت کا پتہ بتا دیں تو میں اس سے خصوصی انٹرویو لے لوں"

باغی کی روح نے کہا " ہم شرافت میں بھٹک رہے ہیں"

ایک انتہائی سیدھے سادے آدمی کی روح بڑی خبیث نکلی۔

انسانی سماج کے تقریباً ہر نمائندے کو پرکھنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ دنیا میں شرافت موجود نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی ہم نے ہمت نہ ہاری۔

اعداد و شمار کے مطابق غریب غربا میں تھوڑی بہت پچھلی شرافت کے آثار ملے۔ مجرموں میں غیر اطمینان بخش حد تک اس کے جراثیم پائے گئے۔ قاتلوں اور طوائفوں تک میں اس کی کچھ خو بو ملی۔ مجبوراً ہم نے طریقۂ تحقیق تبدیل کر کے دنیا بھر کے کروڑوں نام نہاد اچھے لوگوں کی خفیہ فہرستیں تیار کیں۔ مختلف معیار و اطلاعات کی بنا پر انھیں گھٹاتے گھٹاتے لاکھوں، ہزاروں، سیکڑوں، یہاں تک کہ درجنوں تک لے آئے۔ آخر میں ایک درجن ایسے بھلے مانسوں کی فہرست تیار کی جو بن مانسوں سے مختلف تھے اور جن کی شرافت کی قسم فرشتے تک بلا تکلف

کھا سکتے تھے۔ بہ مشکل ہم شرافت کے نقطۂ انجماد تک پہنچے۔ یعنی دنیا کا ایک نمبر کا شریف اپنی تجربہ گاہ میں لے آئے۔

ہم اس ذات شریف سے بے حد نروس تھے کیوں کہ یہ دنیا کی شرافت کا آخری ٹیسٹ تھا۔ ہم شرافت کا ایٹم بم داغنے جا رہے تھے۔ اس دنیا کے آخری شریف آدمی سے ہم نے پوچھا "زندگی میں کس موقع پر آپ نے سب سے زیادہ شرافت دکھائی تھی؟" روح نے کہا بچپن تک، جب پالنے میں ہاتھ پاؤں مارتی تھی۔ اس وقت تک مجھ میں شرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔"

"سن شعور پر پہنچنے کے بعد کی کیفیت بتائیے؟"

"جوانی کا تعلق شرافت سے نہیں شرم سے ہوتا ہے۔"

"ادھیڑ عمری؟"

"وہ تو اس سے بھی زیادہ بے شرمی کی تھی۔"

"معاف کیجیے گا۔ مگر یہ جو دنیا بھر میں آپ کی شرافت کے ڈنکے بج رہے ہیں؟"

روح نے بے رخی سے جواب دیا "سب ڈھونگ ہے، دکھاوا، سوانگ اور فریب ہے!"

"آخر آپ کے جو یہ اتنے بڑے بڑے خیراتی اسپتال ہیں جن میں نہ جانے کتنے مریض شفایاب ہوتے ہیں؟۔ اتنے بہت سے اسکول، کالج جہاں ہزاروں طلبہ و طالبات دولت علم سے بہرہ ور ہوتے ہیں؟"

اس نے انتہائی بے روح ہو کر کہا

"یہ تو جناب بزنس ہے۔ بھلا اس کا شرافت سے کیا تعلق؟ یہ تو ٹیکس ماری کے سائن بورڈ ہیں۔"

"پھر بھی اتنی خواتین کو آپ خدمتِ خلق کا موقع دے رہی ہیں۔

www.taemeernews.com

باعزت ذریعۂ معاش"۔

روح نے تڑپ کر کہا

"ان ہی سے پوچھیے کہ شرافت کے نام پر ان سے کیا کیا ناجائز فائدے ہم اٹھا رہے ہیں۔

"آپ کی شرافت کی ایک عالم میں دھوم ہے۔ اس کی آخر کچھ تو اصلیت ہو گی؟"

"مسٹر! ظاہر میں باطن کی تلاش بے سود ہے۔ شرافت دھوم دھام کی چیز نہیں جس سے ایوانوں کو سجایا جا سکے۔ اسے تو بنی نوع انسان پسپا کر چکے ہیں۔ دنیا سے شرافت ختم ہی سمجھیے۔ بچی کھچی شرافت گندی بستیوں میں ایڑیاں رگڑ رہی ہیں۔ جیل خانوں میں سڑ رہی ہے، ویرانوں میں بھٹک رہی ہے۔ عشرت گاہوں میں سسک رہی ہے یا ایوانوں میں دم توڑ رہی ہے۔"

ہم نے اس کے خاص خاص کارنامے یاد دلائے تو وہ بولی

"وہ شرافت نہیں ریاکاری تھی۔ دنیاوی کامیابی کے لیے شرافت کے نام پر بڑی رذالت کرنی پڑتی ہے۔" روح نے بے چین ہو کر کہا۔

"شرافت کا لبادہ بہت تکلیف دہ ہے۔ اسے اتار دیجیے پھر میری روح میں جھانکیے۔ باطن کے آئینے میں۔ شاید چھوٹی سے چھوٹی شرافت کا پرتو بھی نہ ملے۔"

ہم نے اس کی شرافت کا لبادہ اتار کر اس کی روح میں جھانکا۔ ہمارے نزدیک جو دنیا کا سب سے شریف آدمی تھا وہ بڑا قاتل، عیار، مکار، فریبی، جواری، سیاست داں، عیاش اور موذی نکلا۔ ہمارے شرافت پیما کے سگنل نے بھی اس کی تصدیق کی۔ مجبوراً دنیا کے سب سے شریف آدمی کو ہم نے اس کے قالب میں واپس کر کے چلتا کر دیا۔

www.taemeernews.com

ہم نے سوچا دنیا بھر میں شرافت تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ لاؤ ذرا اپنے آپ کو ٹٹولیں کہ خود ہم میں کتنی شرافت ہے۔ تمام ماھرین مسمریزم کی روحیں بلائی گئیں۔ سب کی سب انتہائی خبیث نکلیں۔ بلکہ دو ایک تو ان میں بدروحیں تھیں۔ اپنی شرافت کا بھانڈا پھوٹنے کے بعد ہم نے شرافت کی تلاش ختم کر کے اقوام متحدہ کے لیے اپنی رپورٹ تیار کر کے اخباروں میں اشاعت کے لیے جاری کر دی جس کا خلاصہ یہ تھا:

"دنیا میں پہلے یہ شے عام تھی پر اب نہیں پائی جاتی کیوں کہ صدیوں قبل انسان اپنے وسیع تر مفادات کی خاطر شرافت کو جگ نکالا دے چکا ہے۔ اس کی واپسی کی صرف ایک ہی صورت ہے وہ یہ ہے کہ ۲۰ نکاتی معاشی پروگرام کو عالمی پیمانے پر کامیاب بنایا جائے۔"

اخباروں نے ان سرخیوں کے ساتھ ہماری رپورٹ شائع کر دی:

"قدیم انسان کی پس ماندگی کا ایک رخ ــ اس میں شرافت بھی پائی جاتی تھی۔"

"۲۰ نکاتی معاشی پروگرام کی مدد سے واپسی کی ناکام کوشش۔"

---

www.taemeernews.com

میزبان بے زبان

میزبان اس حواس باختہ انسان کو کہتے ہیں جو عموماً اپنے سے بڑے یا اہم آدمی کو کسی خاص موقع پر شرفِ میزبانی بخشنے کے بہانے گھر بھر کو مختلف قسم کی مصیبتوں میں مبتلا کرانے کا وسیع تجربہ رکھتا ہے۔ اس کے ساتھ گھر والوں کی وہی حالت ہوتی ہے جو گیہوں کے ساتھ گھن کی ہوا کرتی ہے۔ گھر بھر میزبانی کی چکی میں پس کر اچھا خاصا گھن چکر بن جاتا ہے۔

علم الانسان کے ماہرین نے میزبان کی تشریح یوں کی ہے:

"دورِ جدید کا ایسا انسان جس کے ایک ہاتھ میں جھاڑن، دوسرے میں جھاڑو ہوتی ہے۔ اسے دوسروں کی صفائی پر بھروسہ نہیں ہوتا۔ اس لیے صفائی کے بعد وہ خود بھی جھاڑ پونچھ کرتا ہے کہ دروازے، کھڑکیاں ٹھیک سے صاف ہیں؟ کہیں جالا تو باقی نہیں۔ کسی صوفے یا کرسی پر گرد تو نہیں۔ اس سلسلے میں وہ مہتر سے باورچی تک کے فرائض ادا کرتا ہے۔ عموماً اس قسم کا انسان شہروں میں زیادہ پایا جاتا ہے۔"

میزبانی کا آغاز مہمانی سے ہوتا ہے۔ میزبان پر مہمان اسی طرح نازل ہوتے ہیں جیسے گنہ گاروں پر عذاب۔ کسی مہمان نے میزبان کے لیے کیا پھڑکتا ہوا مصرعہ کہا ہے۔ ع

ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے

مشرقی تہذیب میں میزبانی اب سے پچاس سال پہلے تک خوش قسمتی

www.taemeernews.com

سمجھی جاتی تھی، جس کا فن یہ تھا کہ پیٹ بھروں کو کھلایا جائے اور مرجھکوں کو مار مار کر ہنکا دیا جائے۔ یہ روایت اب بھی برقرار ہے۔

میں بنیادی طور پر میزبان ہونے کے مقابلے میں مہمان ہونا زیادہ پسند کرتا ہوں۔ نہ تو میں مہمان ہوتے ہی اس بات کا اعلان کرتا ہوں کہ "گرم پانی سے غسل میری کمزوری ہے" نہ یہ کہتا ہوں کہ "میں چائے سے پہلے ایک گلاس گرم دودھ پیتا ہوں جس میں کم از کم پاؤ بھر بالائی ہو جس کو معتدل بنانے کے لیے اس میں آدھ پاؤ پستہ اور بادام پیس کر ملا دیا جائے۔ اور محض دو انڈے توڑ کر ان کی زردی ڈال دی جائے"۔ نہ میں میزبان پر انکشاف کرتا ہوں کہ اصلی گھی میری کمزوری ہے۔ ڈالڈا اگلا پکڑ لیتا ہے۔ گوشت میں کہاں کھاتا ہوں اس لیے جانور بٹیر سے چھوٹا نہ ہو، اور مرغ سے بڑا نہ ہو۔ یوں میں بھی مرغ پر تیتر کو ترجیح دیتا ہوں۔ نہ میں جاتے ہی میزبان کو پان کا ڈبہ تھماتے ہوئے فرمائش کرتا ہوں کہ "بھئی اس میں پان۔ چھالیہ۔ زردہ۔ قوام، الائچی وغیرہ بھروا دو" میں تو بس جاتے ہی کہہ دیتا ہوں کہ بھئی تکلف کی ضرورت نہیں۔ گھر میں جو سبزی، دال، بھات، روٹی ہو وہی کھلا دو۔ اہتمام سے تکلف اور غیریت کی بو آتی ہے۔

مجھے جہاں بھی جانا ہوتا ہے بس ذرا بن سنور کر تیار ہو جاتا ہوں۔ میزبان نے جو وقت دیا ہے اس سے دو یا ڈھائی گھنٹہ بعد ٹھاٹھ سے پہنچتا ہوں۔ نہ مہمان دار کو شرمندگی کہ ابھی تو اس نے نہ کوئی تیاری کی تھی نہ کوئی صاحب تشریف لائے۔ پہنچتے ہی ہاتھوں ہاتھ لیے گئے۔ میزبان جو بے صبری سے منتظر تھا کہ موصوف تشریف لائیں تو چرندم خورندم کا خوش گوار سلسلہ شروع کیا جائے وہ بھی خوش ہو گیا جس کا مفید نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خاطر مدارات کا سلسلہ واپسی تک جاری رہتا ہے۔

میزبانی کا چکر میں اس لیے نہیں پالتا کہ اس میں اچھے خاصے شریف

آدمی کی فی زمانہ درگت بلکہ حجامت بن جایا کرتی ہے۔ پھر بھی شریف آدمی ہیں ناقدرے نہیں۔ اس لیے اگر کبھی پھنس گئے تو میاں! ہوٹل زندہ باد! ایک تولسٹ لطیف تک وقت مقررہ پر پہنچ جاتے ہیں۔ دوسرے کھایا پیا، ہنسے بولے، بل ادا کیا، شکریہ ادا کیا، چل دیے۔ اتنے تھینکس ملتے ہیں کہ بل ادا کرنا تک نہیں کھلتا۔

میزبانی کے باقدہ دورے تو ہمارے عزیز دوست علامہ شہرت پر پڑا کرتے ہیں۔ ہر چند کہ علامہ صاحب کی میزبانی ہمیں ہمیشہ مہنگی پڑتی ہے۔ تجربہ ہے کہ ان کا ایٹ ہوم تک کبھی خالی از علت نہ نکلا اور ان کا ایک ایک مرغ فائیو اسٹار میں ڈنر سے بھی مہنگا پڑا۔ ہمیشہ ان کی دعوت سے ہم بھاگے انھوں نے ہر بار دوڑایا اور وہی جیتے۔ ہم ہارے۔

ایک دفعہ ایسا اتفاق ہوا کہ ہم علامہ صاحب کے مہمان تھے۔ علامہ ٹھہرے پیدائشی کنوارے۔ شادی کی عمر نکل جانے کے باوجود خوش تھے کہ "اس میدان میں اب سب سے سینیر ہوں"۔ جہاں تک علامہ کی شادی کا مسئلہ ہے تو اس سلسلے میں جتنے منھ اتنی باتیں اور مختلف افواہیں ہیں۔ وہ اپنے کنوارے ہونے پر ہر عیب کی طرح حسب معمول فخر کیا کرتے تھے مگر جب شادی کا ذکر چھڑ جائے اور بات ان کی جوانی تک پہنچ جائے تو وہ بالکل لیٹر بکس بن جاتے تھے جس میں ہر محبت نامہ ڈالا جا سکتا ہے مگر لیٹر بکس سے کچھ معلوم نہیں کیا جا سکتا۔ وہ منزل تک پہنچا سکتا ہے مگر منزل کے بارے میں کچھ بتا نہیں سکتا۔ وہ اس طرح مسکین کی طرح نظریں نیچی کر کے چپ چاپ رہتے ہیں کہ جیسے مزدور مالک کے سامنے یا کلرک افسر کے سامنے۔ ایسے میں وہ پچپن کے سن میں بھی پندرہ کے معلوم ہوتے ہیں اور شبہ ہوتا ہے کہ ایجاب وقبول کی منزل پر ہیں۔ پچپن تو ہمارا بیان انکساری ہے ورنہ وہ عمر کی اس منزل پر پہنچ گئے ہیں جہاں آدمی چاہے شرمائے یا ٹھنڈی سانس بھر کے خاموش

ہو جائے۔ ان کی اس شرم ناک خاموشی نے بہت سی داستانوں کو جنم دیا جو حلقہ احباب میں افواہوں کی طرح گشت کرتی اور موسم کی طرح بدلتی رہتی ہیں۔

علامہ کے ایک ہمدرد کا بیان ہے کہ نصف صدی قبل نوجوانی میں کہیں آنکھ لڑ گئی تھی یعنی انھوں نے کسی کو دل ہی دل میں پسند کر لیا تھا مگر ان پسندیدہ صاحبزادی کے فرشتوں کو اس کا کبھی علم نہ ہو سکا۔ پھر یہ اپنے چکروں میں ایسے غائب ہوئے جیسے سینما ہال میں جب فلم اپنے کلائمکس پر ہو تو بجلی غائب ہو جائے اور انھیں پتہ بھی نہ لگ سکا کہ وہ ماہ جبیں کب بیاہ کر پردیس سدھار گئی۔ ان کے دل کے قبرستان میں اس کا مزار محبت ہے جس کے وہ جاروب کش ہیں۔

ان کے ایک دوست جن سے علامہ کے تعلقات راز و نیاز کی حد تک تھے، کا محتاط بیان ہے کہ کبھی کہیں راہ میں کسی الھڑ لڑکی کی، ہر بڑ میں آپ سے کہنی اس طور پر چھو گئی کہ یہ سینما کے ٹکٹ کی لائن کے ریلے میں تھے۔ موصوف کے جسم میں کہنی سے دماغ تک سیکڑوں بجلیاں سی چمک گئیں۔ کوندے لپک گئے۔ دوران فلم یہ بجائے پکچر کے اس کی کہنی دیکھتے رہے۔ جب فلم ختم ہوئی تو نہ اس کی کہنی پہچان سکے نہ اس کی پیٹھ۔ کہ وہ کون تھی۔ اسی کوشش میں یہ ہر شو میں ٹکٹ کی لائن میں جا کر لگتے مگر پھر کبھی نہ کہنی ٹکرائی نہ بجلی چمکی۔

ایک واقعہ اور بیان کیا جاتا ہے کہ کسی افسانہ نگار خاتون کی تصویر آپ کو بڑی پسند آئی۔ آپ نے اس کا افسانہ بار بار پڑھا اور افسانے کی تعریف لکھ کر رسالہ میں بھیج دی۔ رائے بے حد بے ضرر سی تھی اور چھپ گئی۔ افسانہ نگار خاتون نے محض اخلاقاً آپ کو شکریہ کا خط لکھ دیا۔ خط ایک ایسی ٹھوس بنیاد تھا کہ آپ اس پر عاشق ہو گئے۔ جب بھی خط کا جواب لکھنا چاہتے تو ان کے سارے جسم میں تھرتھری سی پیدا ہونے لگتی۔ ہاتھ کانپنے لگتے اسی لیے خط کبھی شروع ہی نہ ہونے پایا۔ عرصہ بعد ایک محفل میں دونوں کا ایک دوسرے سے

www.taemeernews.com

میزبان نے تعارف کرا دیا۔ ان افسانہ نگار خاتون نے اپنے شوہر اور نصف درجن بچوں سے تعارف کرایا۔ بہ مشکل انھوں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور بے ہوش ہوتے ہوتے بچے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ گھر آنے کے بعد بے ہوش ہو گئے تھے۔ ہمیں اس بات پر اس لیے یقین ہے کہ ان کا ہر کام بہت ہی تاخیر سے ہوتا ہے۔ فیصلہ نہ کر پائے ہوں گے کہ بے ہوش کہاں پر ہوں۔ مگر وہ تو ہونا تھا اس لیے ہو گئے۔

علامہ کے جب ہم مہمان ہوئے تو وہ اس لیے خوش تھے کہ مجھے اور میرے ملازم کو ملا کر اب ان کی باقاعدہ فیملی ہو گئی۔ اور کہتے۔ اب یہ باقاعدہ گھر تو معلوم ہوتا ہے۔ یوں تو علامہ کے یہاں نوکروں کے علاوہ ہمیشہ کچھ رشتہ دار بھی نظر آتے ہیں، مگر ہم تو ان کے باقاعدہ مہمان تھے اور وہ میزبان۔ ابھی سکون کے ہم نے دو چار ہی دن گزارے تھے کہ ایک پر بہار صبح کو ہم نے محسوس کیا کہ علامہ یا تو گھر میں زلزلہ لے آئے ہیں یا پھر قسطوں میں قیامت آ رہی ہے ورنہ سپر پاورس آپس میں ٹکرا گئی ہیں اور اب دنیا کا خاتمہ قریب ہے۔ تھوڑی دیر بعد ان کے چیخنے، چلانے اور بھاگنے دوڑنے کی آوازیں آنے لگیں۔ کئی بار تو ہم پکارتے ہی رہ گئے۔ مگر وہ عجیب حلیے میں ہمارے سامنے سے سرپٹ نکل گئے۔

جائے حادثہ اور موقعِ واردات کا معائنہ کرنے کے لیے ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہم نے پہلی بار علامہ صاحب کو جس ہیئتِ کذائی میں دیکھا اس پر یقین کرنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ تفتیش سے معلوم ہوا کہ چھت پر سے کوئی چوہیا اچانک ان کے بستر پر گری اور یہ اچھل کر بھاگے اور پھر جب دوڑتے ہوئے داخل ہوئے تو ان کی چادر میں الجھی ہوئی وہ اچک پھاند کر رہی تھی اور پھر یہ پاجامے کے پائینچے سے الجھ کر گر پڑے۔ جب ان کی طبیعت قدرے بحال ہوئی تو انھوں نے کہا

www.taemeernews.com

"آپ ہوٹل میں ناشتہ کرنے جا رہے ہیں۔ چلیے آپ ناشتہ کیجیے گا اور میں آپ کو پورا واقعہ بتاؤں گا۔"

میں نے پوچھا

"علامہ آپ نے ناشتہ کر لیا؟"

"ناشتہ تو نہیں کیا۔ آپ کے ساتھ کروں گا"

اور ہم لوگ اس بلائے بے درماں کے علامہ پر حملے کی داستان سنتے ہوئے ناشتہ کرنے چل دیے۔

دوپہر کو علامہ خبر لائے کہ بل اگر آپ ادا کریں تو میں آپ کو بہترین ہوٹل میں لے چلوں۔

بھوک کے مارے برا حال تھا۔ ہم نے کہا "چلو"۔ اب ہم خوشی خوشی آگے آگے چل رہے تھے۔ کہتے جاتے

"بہترین بریانی ہوتی ہے اور آئس کریم کا کیا کہنا"

جیسے ہی ہم علامہ کے مہمان ہوئے ازراہ قدردانی انھوں نے پڑوس کے ہوٹل کے بیرے کو بلا کر اس کا سامنا کرا دیا "جب بھی صاحب یہاں سے پکاریں، تم فوراً چائے لے کر آجانا۔ جاؤ چائے لے آؤ"۔ جب چائے پی چکے تو کہنے لگے "منھ کیا دیکھتا ہے، صاحب سے چائے کے پیسے مانگ"۔ میں نے پیسے دے دیے۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد آکر پوچھتے "چائے منگوا دوں؟" خالی چائے کلیجے پر جا کر ٹن سے لگتی ہے۔ مکھن لگے تو میں بھی منگوا لوں؟

میں تو کام سے گیا تھا، مگر جب بھی جانے کا نام لیتا وہ آب دیدہ ہو جاتے اور کہتے "آپ کے جانے سے بڑی تکلیف ہو جائے گی۔ آپ اسے اپنا ہی گھر سمجھیں اور مجھے مہمان"۔

دوسری بار جب میں وہاں گیا اور ہوٹل میں ٹھہر گیا۔ یہ ملے تو موٹر سائیکل

www.taemeernews.com

رک کر بہت بگڑے اور بولے

"اس میزبان قدردان کے ہوتے ہوئے آپ اور ہوٹل میں ٹھہریں؟"

میں نے پوچھا "آپ کیوں چاہتے ہیں کہ میں ہوٹل میں نہ ٹھہروں؟"

کہنے لگے "اس لیے کہ میں ٹھہرا کاروباری آدمی۔ آخر ہر وقت کھانے اور ناشتہ کے لیے کہاں دوڑ سکوں گا۔ ساتھ رہیے گا تو کم از کم اس کا تو اطمینان رہے گا کہ خود نہیں گئے تو آپ نے نوکر ہی سے منگا لیا۔

---

www.taemeernews.com

فن لطیفہ گوئی

مختصر ترین واقعے کو جس میں مزاح کی چاشنی ہو اور عمدہ اور لطیف پیرائے میں اس طرح بیان کیا جائے کہ ان الفاظ یا فقروں کو سننے والوں کو ہنسی آجائے لطیفہ کہیں گے۔ اس کے لیے حسن بیان وحسن ادا کی پابندی ضروری ہے۔ واقعہ کی دلچسپی ندرت بیان کے ساتھ اعتدال لیے ہوئے ہو، سنانے والوں اور سننے والوں میں ذہنی ہم آہنگی تشبیہہ واستعارہ کے ربط کے ذریعہ. موجو لطیفے کی جان ہیں اور جن کی مدد سے ہمارے جذبات ہمارے تخیل سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔

لطیفے کا حسن اس کے اختصار میں ہے۔ ادھر مقرر کے منھ سے پھول جھڑنا شروع ہوں ادھر محفل میں قہقہوں کے جگنو چمکنے لگیں۔ اسی لیے اسے اجمالی مزاح بھی کہا جا سکتا ہے۔ لمحاتی طور پر یہ ذہنی کھیل ایک ہنگامی فرار ہے اس مشینی دور کی اکتا دینے والی زندگی سے جسمیں فرد کی حیثیت ختم ہو گئی ہے۔ وہ خود مشین کا ایک پرزہ بن کر رہ گیا ہے۔ لطیفے کے وقفے تک انسان سنجیدگی کے خول سے باہر آجاتا ہے اور جو وقت لطیفہ کہنے اور سننے میں کٹتا ہے وہ روزمرہ کے غم سے الگ ہو جاتا ہے۔ اتنی دیر کے لیے ہم آپس کے سب اختلاف بھول کر ایک دوسرے کے ہم آواز ہو جاتے ہیں۔

کچھ مشینی دور ہی پر موقوف نہیں۔ ہر دور اپنے مصائب و مسائل اپنے ساتھ لاتا ہے۔ مگر انسانی تاریخ گواہ ہے کہ جہاں اس نے ہمیشہ اپنی راہ

میں کانٹے بچھائے اور ہٹائے ہیں وہاں اس نے کانٹوں میں پھول کھلانے کی جد و جہد بھی جاری رکھی ہے۔ اس حیوان ظریف کی یہی خوش طبعی ہمارے موضوع سے گہرا تعلق رکھتی ہے۔

لطیفے کے لیے ضروری ہے کہ مذاقِ سلیم پر بار نہ ہو، سماعت پر گراں نہ گزرے۔ اسی لیے لطیفے کو روحِ فصاحت اور نشاطِ روح کا درجہ دیا گیا ہے۔

لطیفہ ایک نہایت ہی لطیف شے ہے جس کے بیان کے لیے ایک خاص قسم کی ذہانت، حاضر جوابی اور بے ساختہ پن کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر لطیفہ بحرِ طویل میں چلا گیا تو وہ حکایت، داستان، قصہ، افسانہ غرض کچھ بھی ہو سکتا ہے مگر لطیفہ کے ذیل میں ہرگز اس کا شمار نہ ہوگا۔ پھر اس میں پانی میں اٹھنے والے بلبلے کی حبابی کیفیت نہ رہے گی، اسے خندہ قلقل نہ کہا جا سکے گا، اس کے انوکھے پن کا خمار اتر جائے گا۔

لطیفہ اچھا ہو لیکن اگر سنانے والا اس کے فن سے ناواقف ہو، جذبات، تاثرات و لہجہ کے اتار چڑھاؤ پر قدرت نہیں رکھتا، دورانِ بیان اصل نکتے سے ہٹ جاتا ہے، تمہید کو طول دے دیتا ہے، کھانسنے اور کھنکھارنے لگتا ہے، درمیان میں لطیفہ بھول جاتا ہے، تو پھر لطیفے کی نزاکت، تجسس و لطف رخصت ہو جائے گا۔ اس سے زیادہ نازک مسئلہ لطیفہ لکھنے کا ہے۔ مخصوص واقعات، حالات اور ماحول سے متعلق لطیفہ ہو سکتا ہے کہ صفحہ قرطاس پر آکر بے روح و بے جان ہو جائے اور اس میں وہ کشش بھی باقی نہ رہ جائے جسے ہم کاغذ کے پھولوں ہی سے تشبیہ دے سکیں۔ اور بعض لطیفے تو ایسے ہوتے ہیں جنھیں بیان کیا ہی نہیں جا سکتا۔ بہت کم لطیفے ایسے ہوتے ہیں جو کاغذ پر آنے کے بعد بھی اسی قدر تازہ اور سدا بہار رہ جائیں۔

لطیفے کی ابتدا انسانیت کے آغاز کی داستان ہے۔ انسان جوں جوں تہذیب سے آشنا ہوتا گیا اس کا جوہر نکھرتا گیا، جیسے جیسے اس کی اقامتی

زندگی میں ٹھہراو آتا گیا وہ عام انسانی تعمیر و ترقی میں زیادہ دل چسپی لینے لگا۔ اس کی یہی دل چسپی وہ نکتہ ہے جہاں سے لطیفے کے آغاز اور فنون لطیفہ کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس کو شروع ہی میں معلوم ہو گیا تھا کہ وہ رونے کی طرح ہنسنے کے لیے بھی پابند و مجبور ہے، اس کے نفسیاتی و فطری جواز سے وہ کبھی لاشعوری طور پر بھی بے خبر و منکر نہ ہو سکا۔ ہنسی کے عضویاتی عمل سے قطع نظر وہ بذاتِ خود کا ملکہ قدرت کی جانب سے لے کر آیا تھا جس نے اسے ثابت قدمی، مسلسل جد و جہد اور حرکت پر قائم رکھا۔ اس کے انھیں عزائم نے زندگی، زندہ دلی اور شوخیوں کے سائے میں قدرت اور اس کے مظاہر پر فتح پائی۔ غاروں اور پیڑوں پر رہنے والے نیم وحشی انسان نے اپنی حس کا اظہار دشمنی کی کھال اتار کر اور اس کا سر قلم کر کے کیا۔ اس میں عصبیت تھی، جھنجھلاہٹ اور ذہانت تھی۔ یہ وحشیانہ جذبہ تہذیب کے عروج نے دبایا تو نہیں مگر کم ضرور کر دیا۔ آج بھی غصہ سے پاگل ہو جانے اور عقل سے ہاتھ دھو لینے والے انسان کی دیوانگی اور بچوں میں یہ جذبہ مل جاتا ہے جس میں تکلیف دے کر لطف اٹھانے کی آرزو ملتی ہے۔ کیلے کے چھلکے سے پھسل کر کسی موٹے آدمی پر ہنسنے، کسی نیم پاگل انسان کو ستانے کی صورت میں اس کا اظہار آج بھی عام ہے۔ اس عملی مذاق کے پردے میں بنیادی طور پر وہ انسانی جذبہ پسِ پشت رہ جاتا ہے جو کسی بیمار، بے کس و بے زبان سے ہمدردی و مدد پر اکساتا ہے۔ وہ کمزوریاں اور خامیاں جو آج بھی انسان کے بس میں نہیں اور جن کے لیے وہ قدرت کے آگے بے دست و پا ہے اس کو لطیفے میں اڑا دینا ایک ایسا لطیفہ ہے جس میں کوئی جان، کوئی روح اور کوئی آمد نہیں، جہاں طنز کا وار خود اپنے اوپر ہوتا ہے اور اس سے محض ذہنی پستی وہ کج روی کا اظہار ہوتا ہے جس میں آورد ہی آورد ہے۔ عملی مذاق یا لطیفے کی انتہائی ناتراشیدہ و ناپختہ شغل نے رفتہ رفتہ ارتقائی منازل طے کر کے اب یہ صورت اختیار

www.taemeernews.com

کرلی ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان کی ذہانت کی اپیل پر ہنستا ہے۔ کون متکلم ایسا ہے جو اپنے ہم جلیسوں و ہم زبانوں کو خوش کرنا پسند نہ کرے گا۔ بذلہ سنج اس قابلیت کا مالک ہوتا ہے اور بالعموم وہ ہر دل عزیز بھی ہوتا ہے۔ بذلہ سنجی کے پائے لطافت و نزاکت نے اہل علم کو بہت جلد اس کی جانب متوجہ کر لیا۔ علم و اخلاق کے مبلغین نے اس کے پردے میں ناآشناؤں کو آشنائے راز کیا۔ جہالت، ظلم اور سماجی ناانصافی کے طوفان پر عقل و ذکاوت کے بند باندھے اور لطیفہ بالواسطہ طور پر اصلاح و تربیت کا ذریعہ بن گیا۔

ہمدردی و انسانیت کی جھلکیوں کے ساتھ گہری وابستگی نے تقریر، تحریر، عمل، صوت، حرکات و سکنات کے ذریعہ اس کا اظہار عام سے عام تر کر دیا۔ فنون لطیفہ کی یہ شکل رفتہ رفتہ عوام و خواص میں سب سے زیادہ مقبول و معروف ہوئی۔ ان کے لطائف نے زندہ دل بزرگوں کے برجستہ مکالموں کی شیرازہ بندی میں وہی حیثیت اختیار کر لی جو قومی اور ملکی ادب میں لوک گیتوں کی ہو سکتی ہے۔

غیر شائستہ، خلاف قیاس و اخلاق لطائف علم سینہ ہی کی پنہائیوں میں غرق رہے خواص اور اہلِ علم تو درکنار عوام کے باشعور و سنجیدہ طبقے میں بھی کبھی انھیں قبول عام کی سند حاصل نہ ہو سکی۔ ان کی نفی ایک طرف تعلیم یافتہ اور مہذب طبقہ نے کی تو دوسری طرف مذہبی و اخلاقی حلقے بھی ان کی کھلم کھلا مذمت کرتے رہے۔ اس وجہ سے پست و اخلاق سوز لطائف مجلس و محفل کی کبھی زینت نہ بن سکے اور اس طرح یہ بازار کا گرا ہوا ہار کبھی گلے کی زینت و زیور نہ بن سکا۔ گھروں میں وہی صاف ستھرے اور پاکیزہ لطائف مقبول رہے جو ذکاوت و ذہانت کا مرقع تھے اور جن کے انوکھے پن میں مسکراہٹوں کی بجلیاں اور قہقہوں کے انار تھے۔

چوں کہ لطیفہ گوئی قاری اور سامع دونوں کو فائدہ پہنچاتی ہے اور سبھی کی دل پسند چیز ہے اس لیے اس کے بارے میں ہرگز دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔

لہٰذا اچھا مبلغ، مقرر، معلم و سیاست داں بھی وہی سمجھا گیا جو ساتھ ہی اچھا لطیفہ گو بھی ہو، جو نفس مضمون، مطلب اور حصول خواہش کی خشکی اپنی بذلہ سنجی سے دور کر سکے، اپنی حاضر جوابی کی سامع وقاری سے فی البدیہہ داد حاصل کر سکے۔

یہ بحث بہت پرانی ہے کہ ہم کس چیز کو خلاف تہذیب کہیں گے اور کس کو تہذیب کے دائرے میں لائیں گے۔ فحش اور غیر فحش بھی اضافی ہیں۔ کل تک جو معیوب نہ تھا وہ آج سراپا عیب سمجھا جاتا ہے اور جو آج مستحسن ہے ہو سکتا ہے کل اس کا شمار گناہ کبیرہ میں کیا جانے لگے۔ قدریں بدلتی رہتی ہیں، انھیں کے ساتھ فکر و نظر کے پیمانے بھی تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ قدیم لکھنؤ کے شرفاء بے تکلفی سے سر بازار ضلع جگت کرتے، پھبتی کستے، فقرے چست کرتے تھے مگر آج کی تہذیب اس کی روادار نہیں جب کہ یہ بات اپنی جگہ پر طے ہے کہ گزشتہ لکھنؤ کی تہذیب آج کے مقابلہ میں بہت بلند تھی۔ اس کے معیار شائستگی کی آج بھی ہم قسم کھا سکتے ہیں۔ یورپ میں سر بازار کسی حسینہ کا بوسہ لینا یا اس سے بغل گیر ہونا داخل اخلاق ہے اور اس کو نظر انداز کرنا بداخلاقی مگر آج بھی یہ ہماری مشرقی تہذیب میں یہ انتہائی معیوب سمجھا جاتا ہے اور ایسا کرنے کی کوشش کرنے والا اخلاقی و قانونی گرفت میں آجاتا ہے۔

کسی کو خوش کرنا عقلاً و اخلاقاً ایک مستحسن فعل ہے۔ اہل ایمان کی ایک تعریف یہ بھی ہے کہ "ان کے چہرے ہنستے ہوئے ہوں گے۔ لطیفے کو "مزاح المومنین" کا درجہ عطا کیا گیا ہے اور مومن کی یہ پہچان بتائی گئی ہے کہ "مزاح کی کوشش کرتا ہے اور شیریں سخن ہوتا ہے"۔ خود حضرت علی نے اسے "حکمت کے نکتوں کا تحفہ" کہا اور "اشرف المخلوقات کی پہچان" قرار دیا کیوں کہ بذلہ سنجی سے عقل پر جلا ہوتی ہے۔

لطیفے کی چار قسمیں ہیں (۱) تبسم آفریں (۲) خندۂ دنداں نما (۳) قہقہے (۴) کتیفے۔

www.taemeernews.com

تبسم آفریں لطیفہ کا شمار مزاح یا سنجیدہ ظرافت میں ہے۔ یہ لطیفے کی سب سے اعلیٰ قسم ہے۔ اس کا تعلق دل سے نکلے ہوئے برجستہ فقرے، اچانک واقعے یا خوش گوار حادثے سے ہوتا ہے۔ اس کی تحریک بذلہ سنجی، خوش مذاقی، رمز، طباعی یا کسی تلمیح کے پردے میں ہوتی ہے۔ یہ فطری لطائف مخصوص شخصیات، واقعات، فضا اور ماحول کی پیداوار ہوتے ہیں۔ ان میں جذبات کی تسکین، مسرت حاصل کرنے اور دوسرے کی ذہانت پر ہنسنے ہنسانے پر مبنی ہوتی ہے۔ غیر معمولی تاریخی شخصیتوں، بے حد ذہین اور فہیم انسانوں، رہنماؤں، فلسفیوں، سیاست دانوں، معلموں، مبلغوں، صحافیوں اور دیو پیکر شخصیتوں کے حالات و واقعات اس قسم کے دل کش لطائف سے پر ہیں۔ یہ قطعی بے ضرر ہوتے ہیں اور ساحری کی حد تک انسان کو مسحور کر کے اس کو بچپن کی طرف لے جاتے ہیں۔ اس طرح عام زندگی بسر کرنے کی قوت ہنسی کی صورت میں نکل کر بچ جاتی ہے۔ مثلاً

> "شاہ عراق جس وقت گیارہ سال کے تھے اور لندن میں زیر تعلیم تھے ایک دفعہ ایک ماہر نفسیات نے ان سے کہا۔"جب میں بائسکل پر سوار رہتا ہوں تو میرے سوچنے کی رفتار دوگنی ہو جاتی ہے۔ شاہ نے جواب دیا" پھر تو آپ کو موٹر سائکل پر بیٹھ کر سوچنا چاہیے"

لطیفے کی دوسری قسم خندۂ دنداں نما ہے۔ اس کا شمار مذاق کے ذیل میں ہوتا ہے یعنی چھیڑ چھاڑ، چوٹ کرنے، جملہ چپکانے، فقرہ یا پھبتی کسنے، ضلع جگت یا طنز کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔ ان میں افادیت ہوتی ہے اور خواہش کی تسکین کے لیے کسی پر حملہ کیا جاتا ہے۔ اس میں عدم تسکین کی بچت ہنسی کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ مثلاً

> آسکر وائلڈ کا ایک ڈرامہ پہلی رات فیل ہو گیا۔ دوسرے دن اس کے دوست نے پوچھا "کہو یار تمھارا ڈرامہ کیسا رہا؟" آسکر وائلڈ نے جواب دیا "ڈرامہ بے حد کامیاب رہا لیکن دیکھنے والے فیل ہو گئے"۔

لطیفے کی تیسری قسم قہقہہ ہے۔ یہ تمسخر کی فہرست میں داخل ہے اور لطیفے کی سب سے خاص قسم ہے جو ظرافت خوش مذاقی اور طباعی کی پیداوار ہے۔ اس میں خاص چیز اس کا بے ساختہ پن اور انوکھی سادگی ہے۔ جس سے سامع وقاری بے اختیار اور اچانک ٹھٹھا مار کر ہنسنے لگتا ہے اور یہی ہنسی دراصل ہے اس بچت کی جو ہمدردی کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔

"ایک تھیٹر کے مالک نے ایک طوطا پال رکھا تھا جو تھیٹر کے باہر پنجرے میں لٹکا رہتا تھا۔ جب لوگ ٹکٹ لینے آتے تو طوطا کہتا "باری باری آئیے مہربان؛ لائن بنائیے مہربان"۔ اس پر لوگ لائن میں لگ جاتے۔ ایک دن پنجرہ کا دروازہ کھلا رہنے کی وجہ سے طوطا اڑ گیا۔ طوطے کا مالک اسے ڈھونڈھتا ہوا ایک جنگل سے گزر رہا تھا کہ اس نے دیکھا کہ اس کا طوطا بہت سے کوّوں میں پھنسا ہوا ہے اور کوّے اسے چونچیں مار رہے ہیں اور طوطا کہہ رہا ہے "باری باری آئیے مہربان۔ لائن بنائیے مہربان، لائن بنائیے"۔

لطیفے کی چوتھی قسم کثیفہ ہے۔ دنیا بھر کے لطائف خاص طور پر اردو لطائف اس سے معمور ہیں۔ یہ لطائف کی مکروہ شکل ہے۔ ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ عموماً یہ لطائف اچھی صحبتوں، پاکیزہ محفلوں اور گھروں میں نہیں سنے سنائے جا سکتے۔ ان کا تعلق "علم سینہ" سے زیادہ ہے۔ ان کی بنیاد پھکڑ پن، ہجو، ضلع جگت، عریانی، فحش اور پھبتی پر ہے۔ اس کا اظہار عموماً ہر سال پہلی اپریل کو عملی مذاق کی صورت میں بھی ہوتا ہے جس میں لطیفے کم ہوتے ہیں مگر سنائے اور گڑھے زیادہ جاتے ہیں۔ کثیفے وحشیانہ جذبات وخیالات کے اظہار سے زیادہ قریب ہیں ان میں لطائف کم اور آورد زیادہ ہوتی ہے۔ مثلاً

ایک دن ایک طوائف ایک مجلس میں گئی اور اس نے اپنا جوتا رومال میں لپیٹ کر اپنے پاس رکھ لیا۔ ایک امیر نے دریافت کیا "آپ کا جوڑا

www.taemeernews.com

بھی آپ کے ساتھ رہتا ہے؟" طوائف نے جواب دیا "جی ہاں حضور میرا جوڑا تو میرے پاس ہے مگر آپ امیروں کا جوڑا نوکروں کے بغل میں رہتا ہے۔"

اکثر بے وقوف شخص یا معصوم بچہ بھی لاشعوری طور پر ایسا لطیفہ سرکر دیتا ہے جو ہمیشہ کے لیے ذہن و تاریخ میں محفوظ ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر اس بات کا نفسیاتی تجزیہ کیا جائے تو اس واقعے کے تانے بانے کسی ایسے شخص، غیر معمولی واقعہ حال یا خیال سے لاشعوری طور پر مل جائیں گے جس نے اپنے معمولی ذہن کو حرکت دے کر ایسا غیر معمولی نمونہ پیش کیا۔ ضروری نہیں کہ آپ میرے خیالات سے متفق ہوں مگر اس حقیقت سے انکار مشکل ہے کہ زیادہ تر لطائف غیر معمولی شخصیات، واقعات و حالات سے جنم لیتے ہیں یا منسوب ہیں۔ یوں بھی ہمارے آپ کے حلقۂ احباب میں ایسی باغ و بہار شخصیتیں خال خال نظر آتی ہیں جن کی آمد بادِ نسیم سے زیادہ لطیف اور خواب سے زیادہ نشاط آور ہوتی ہے۔ جن کی ہر بات ایک لطیفہ ہوتی ہے اور باوجود اپنی سنجیدگی، تمکنت و وقار کے محفل کو دم بھر میں زعفران زار بنا دیتے ہیں۔ اس قسم کی شخصیتیں ہر عہد اور ہر دور میں مل جاتی ہیں۔ یہی وہ طاقت ور دماغ ہیں جو لطیفہ کے موجد و سرچشمہ قرار دیے جا سکتے ہیں۔ ان کے ذہنی ارتقا و اختراع کا مطالعہ دراصل لطیفے کی تاریخ کا جائزہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہی باغ و بہار ٹھوس شخصیتیں اعلیٰ سطح پر جا کر فلسفی، رہنما اور مبلغ بھی ہو سکتی ہیں۔

واقعاتی طور پر کسی خاص واقعے کو کسی خاص تشبیہ، استعارے یا کنایے کے ذریعہ دوسرے واقعہ کو اس طرح جوڑ کر عام واقعات سے مختلف، انوکھا، اس کے مماثل یا برعکس ہو جائے اور اصل واقعہ کی تحریک کرے، لطیفے کے اقسام میں داخل ہو جاتا ہے۔ مخصوص ماحول یا فضا سے بھی لطیفہ جنم پا سکتا ہے۔ یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ہمارا موضوع انسان ہے۔

www.taemeernews.com

اس کے حادثات، حالات، واقعات ماحول، سماج اور ان کے آپس کے ٹکراؤ سے عدم توازن کی صورت میں جو مختصر واقعات رونما ہوتے ہیں وہ انوکھے پن کی وجہ سے لطیفہ کہلاتے ہیں۔ ہمارا تعلق جمادات و نباتات سے نہیں۔ لطیفے کا کسی نہ کسی صورت میں انسان اور اس کے لوازم سے تعلق از بسکہ ضروری و لازمی ہے۔ غیر جان دار اشیاء ہمارے موضوع سے خارج ہیں، کیوں کہ لطیفے کا زندگی سے بہت گہرا تعلق ہے، اس کو کسی بھی صورت میں اس سے الگ کر کے نہیں دیکھا جاسکتا۔ جو لطیفہ جتنا زیادہ مشہور اور اچھا ہوگا اتنا ہی سماج کی بڑی سے بڑی اکائی یا عالمی انسانی برادری سے متعلق ہوگا اور اس کی جڑیں سماج اور تہذیب کے باغ میں اتنی ہی زیادہ گہری ہوں گی۔

لطیفے کے بیج اسی سرزمین سے پھوٹتے ہیں۔ اس کی بیل ان ہی حالات واقعات اور ماحول کے سائے میں پروان چڑھتی ہے۔ وقت اور خیالات موسم کی طرح بدلتے رہتے ہیں۔ ان بدلتے ہوئے خیالات کا ٹکراؤ جدید و قدیم کی شکل میں کسی بھی دور یا کسی بھی زمانے میں سادہ و معصوم جذبات کے سہارے شگوفے کھلاتا رہتا ہے۔

لطیفے کو اجمالی مزاحیہ بھی کہا جاسکتا ہے۔ اسی لیے اس کے پلاٹ اور مکالمات کا اتحاد عمل اپنے ایجاز کی مدد سے مزاحیہ فضا کی تعمیر کرتا ہے تاثراتی وحدت و اندرونی تنظیم کی تکمیل اس اختصار کے ساتھ عمل میں آئے کہ اس کی منزل اتنی مختصر ہو جائے کہ ادھر تار باجا ادھر راگ بوجھا۔ جملوں کی تراش خراش اور برجستگی بھی ابلاغ کے عمل کو تیز تر کرنے میں معاون ہوتی ہے۔ ضروری ہوتا ہے کہ اس کے محاکاتی جلووں میں حسن ادا اور حسن بیان کی پرچھائیاں بھی ہوں تاکہ جملوں کا رکھ رکھاؤ بہتے ہوئے الفاظ میں ہنسی کے بلبلوں کی صورت میں ظاہر ہو سکے۔ انداز بیان، طرز ادا، اسلوب و خیال کے عمومی سانچے افراد کی ذہنی ساخت و رجحانات سے ہم آہنگ ہوں تاکہ ان لطائف کا تاثر کچھ

اور شدید گہرا اور دیر پا ثابت ہو سکے۔ لطیفہ اس طرح پیش کیا جائے کہ اس کی دنیا میں جہاں حسن و دل کشی، سرور و سرخوشی رقصاں نظر آئے وہاں سماج کے جن افراد کے لیے یہ پیش کیا گیا ہو وہ اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ بھی اٹھا سکیں۔

چوں کہ لطیفہ سنتے ہی ہم بے اختیار ہنسنے لگتے ہیں اس لیے اس کا براہِ راست تعلق طنز و مزاح سے ہے۔ طنز و مزاح کسی مزاحیہ کردار، مزاحیہ صورت واقعہ، لفظی بازی گری، موازنہ یا تحریف کے رنگ و روپ میں ابھر کر سامنے آتا ہے اور اس کا تعلق کسی بھی لطیفے میں اس کی کسی نہ کسی شکل یا صورت سے ضرور ہوتا ہے جن کا لطیفے سے بہت ہی نازک تعلق و لطیف فرق ہے اس لیے اس کو ان سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وہ کیفیتیں ہیں جن میں لطیفہ بالعموم جنم پاتا ہے۔ مثلاً

طنز و مزاح، ظرافت، رمز، نفر، طباعی، بذلہ سنجی، حاضر جوابی، مذاق، عملی مذاق، خوش مذاقی، اداکاری، تحریک، تشبیہ، استعارہ، کنایہ، تکرار، رعایت لفظی، ضلع جگت، ہجو، پھکڑ پن، عریانی، ہزل، زٹل، فحش، پھبتی، آوازہ، طعنہ، فقرہ، فقرہ بازی، جملہ بازی، چوٹ، جلی کٹی۔

لطیفہ گو عموماً ظریف ہوتے تھے جو خوب صورت، خوش سیرت، خوش قیافہ، خوش بیان، ذہین، دانا اور معتدل ہوتے تھے۔ وہ چربہ اتارنے کے فن سے بھی واقف ہوتے تھے۔ وہ لطائف کے پردے میں تاریخی معلومات اور نصیحتوں کے ساتھ، گزری ہوئی زندگی کے اعلیٰ نمونوں سے بھی روشناس کراتے چلتے۔

مثال کے طور پر درویشوں اور داناؤں کی عقل مندی، خودداری، فیاضی، حق پرستی، عبرت اور رہول کی مثالیں پیش کرتے اور حکایتیں سناتے کیوں کہ ان کا سب سے اہم فریضہ پتھر کو موم کرنا ہوتا تھا اور عرض کرنے سے پیشتر جان کی امان پانے کے باوجود جان سخت خطرہ میں رہتی تھی۔ مطلق العنان حکمرانوں

www.taemeernews.com

کے ندیم و وزیر کی حیثیت سے ان کے اندر روشن خیالی اور توازن پیدا کرنا اور انھیں عدل کی سیدھی لکیر سے نہ بھٹکنے دینا اور لطیفے کی لاٹھی کے ذریعہ رعایا کے ان کلّہ بانوں کو غیر شعوری طور پر ہانک کر دوبارہ راہ عدل پر لگا دینا ہوتا تھا۔ خارجی و بیرونی مضر اثرات، عدم توازن بے ڈھنگے پن اور عدم تکمیل پر طنز کر کے وہ اس خدمت کو انجام دیتے تھے۔ ان کا مقصد اس کے پردے میں عمل جراحی کر کے فساد و انتشار کو دور کرنا بھی ہوتا تھا۔ سولی پر چڑھتے وقت لطیفہ سنانا اسی جرأت و عظمت کی داستان ہے۔

ظریف حاضر جوابیوں کا آئینہ تھے۔ ان کے درمیان جو نازک کلامیاں ہوتیں وہ شاہانِ وقت کو اتنی دیر کے لیے جنگی مہمات، پیچیدہ مسائل، سیاست اور تفکرات کے عالم سے اٹھا کر ایک ایسی دنیا میں پہنچا دیتیں جہاں بذلہ سنجی کے سرچشمہ سے مسرت و ذہانت کے سوتے پھوٹتے۔ علم و حکمت کے یہ مہذب جلسے بلا کسی منطقی امداد کے سامعین کو خود بخود اس ذہنی سطح پر لے جاتے جہاں سچی ظرافت اپنے جوہر دکھاتی ہے اور ایسی ہر صحبت یادگار ہو جاتی ہے۔

ہر دربار اور ریاست سے لطیفہ گو یا ظریف وابستہ ہوا کرتے تھے، جن کا کام تھکے ہارے حکمراں کو اپنے باغ و بہار لطائف کے ذریعہ تازہ کر دینا ہوتا تھا ان درباروں میں جب تعیش کی لہر آئی اور انھوں نے میدان جنگ کے مقابلے میں حرم سرا اور خلوت کے مقابلہ میں خلوت کو ترجیح دی تو نہ صرف لطیفہ گوئی کا پیشہ عام ہوا بلکہ ظرفا کی کثرت نے اس پیشہ کو اس کی سطح سے بہت پست کر دیا عام اور سستے مذاق، پھکڑ، ٹھٹھول اور ابتذال کی کھلی چھوٹ نے ظریف کو مسخرہ، بھانڈ اور لطیفے کو کثیفہ بنا دیا ورنہ لطیفہ گو نہایت کڑھا کڑھایا، ترشا ترشایا ماہر فن ہوا کرتا تھا جس کی ذکاوت، ذہانت، علمیت اور سوجھ بوجھ حاضر جوابی، بذلہ سنجی اسے دوسروں سے داد دلواتی تھی بالواسطہ طور پر وہ اتالیق، نگراں یا مشیر کار کے فرائض بھی انجام دیتا تھا۔

www.taemeernews.com

جیسے بیربل اور ملّا دوپیازہ جو محض ظریف نہ تھے بلکہ دربار اکبری کے نورتن اور وزیر باتدبیر بھی تھے وہ ملکی معاملات پر ایک ماہر سیاست کی حیثیت سے بھی نظر رکھتے تھے۔

لطیفہ گویوں نے بہت سے مجرموں کی خطائیں و سزائیں معاف کرائیں۔ سلاطین وقت کی کایا پلٹ کی، بے قصوروں کو محفوظ کیا، مغلوب سرخرو ہوئے جلاوطن حب وطن کے دامن سے ہمکنار ہوئے۔ بدکرداروں کو نیک بنایا معزول بادشاہوں کو ان کے ملک واپس دلوائے۔ خستہ حالوں کو دم بھر میں آسودہ کیا۔ ان گنت جھگڑے فیصل کروائے شاہان وقت سے بیش بہا صلے پائے۔

تحریر کا فن ایجاد ہونے سے قبل لطائف سینہ بہ سینہ نسل در نسل چلتے رہے تحریر کا فن ایجاد ہونے کے بعد بھی عرصے تک لطائف پر توجہ نہیں کی گئی پھر سلاطین و مشاہیر کے حالات و تصانیف میں ان کی جھلک ملنے لگی۔ قدیم ترین کتاب "حکیم الیسپ کی کہانیاں" ہے جو اس لیے بچوں کے درس اخلاق کے لیے جانوروں کی زبان سے بیان کی ہیں۔ عربی میں سب سے پہلے علامہ جاحظ سنہ ۵ھ تا ۱۵۵ھ اس کی تصنیف "خود اپنی بات" کے لطائف قابل ذکر ہیں جس کی تقلید میں دوسرے قابل ذکر کارنامے وجود میں آئے۔ عربی سے یہ ذوق فارسی میں آیا۔ نظامی سمرقندی نے ۵۵ھ میں "مجمع الانوار" لکھ کر فارسی ادب میں لطائف قلم بند کرنے کی داغ بیل ڈالی مگر سب سے زیادہ مقبولیت "مجمع الحکایت" کو ہوئی اور فارسی میں یہ رواج اتنا جڑ پکڑ گیا کہ ہر تذکرہ و بیاض نگار شعر و ادب کے ساتھ لطائف بھی نقل کرنے لگا "نفائس الحکایات" "مضحکات" اور "مطائبات سعدی" وغیرہ اس سلسلے کی بے حد اہم کڑیاں ہیں۔ اردو کو یہ مذاق فارسی سے ورثہ میں ملا۔ شروع میں لطائف نظم ہوتے رہے۔ میر نے فارسی میں لطائف پر ایک مختصر رسالہ لکھا۔ انشا نے لطافت کے دریا بہائے مگر ادبی لطائف کی باقاعدہ ابتدا مرزا غالب سے ہوئی۔ مولانا حالی نے یادگار غالب میں ان کے لطائف کو ایک

باب کی صورت دی۔ اور مرزا کو حیوان ظریف کہا اس وقت سے اردو میں مشاہیر
www.taemeernews.com
کی سوانح عمریوں میں بھی لطائف کو جگہ دی جانے لگی۔ اسی زمانے میں "پیام یار لکھنؤ" اور "پیام عاشق قنوج" نامی گل دستے شائع ہوتے تھے جو اپنے لطائف کے لیے مشہور ہیں۔ یہی اہتمام بعد میں "فتنہ" اودھ پنچ اپنچ اور اودھ اخبار میں بھی ملتا ہے۔

دنیا کی ہر زبان میں لطیفوں کی دنیا بھی آباد ہے جس میں اس کے اپنے لطیفے کم اور دوسری زبانوں کے زیادہ ہوتے ہیں لیکن ہر زبان میں اکثر ایسے الفاظ ملتے ہیں جن کا مترادف دوسری زبانوں میں نہیں ہو سکتا۔ لطیفہ دراصل عربی کا لفظ ہے جس سے یہ فارسی اور اردو میں آیا۔ انگریزی زبان میں لطیفے کے لیے ہم کو کوئی ایک مخصوص لفظ نہیں ملتا بلکہ Jest، Mot، Wit، Pleasentry، Irony، Pun، Quip، Husvous، Joke، Satire وغیرہ ملتے ہیں۔ دراصل ان سب کا لطیفہ سے بہت ہی قریب کا تعلق ہے مگر پھر بھی ان سے لطیفے کا مفہوم صحیح طور پر نہیں ادا کیا جا سکتا۔ مغربی لطائف کو ہم اسی عنوان کے تحت تسلیم کرتے ہیں جس سرخی کے ساتھ وہ ہم تک پہنچے ہیں۔

لطیفے کی ابتدائی شکل حکایتوں کی صورت میں ملتی ہے۔ جس میں لطیفے کے پردے میں فیلسوف، بزرگ، درویش، صوفیا کرام اور وزیر دانا شاہانِ وقت اور مریدوں کو ان حکمت اور نصیحت آمیز حکایتوں کے ذریعے راہِ حق پر لگانے کی سعی کرتے۔ اس کی مثال حکیم ایسپ یا لقمان، بقراط، ارسطو، افلاطون دیو جانس کلبی، بزرگ چمہر، وید بھان، برہمن، جعفر برمکی، شیخ سعدی، شکسپیر، ڈاکٹر جانسن، ابوالفضل، بیربل، ملّا دوپیازہ اور نعمت خاں عالی محض ظریف اور لطیفہ گو ہی نہ تھے بلکہ اور بھی بہت کچھ تھے۔ ان مفکروں، مبلغوں اور وزیروں کے حکیمانہ نکتوں نے لطیفے کو دربار سے نکال کر مکتب و خانقاہ تک برابر تراشا،

www.taemeernews.com

سنوارا، نکھارا۔ انھیں کی بنیاد پر اخلاق و تہذیب نے گلستاں، بوستاں اور انوار سہیلی جیسے فلک بوس قصر تعمیر کیے۔

دربار کے ساتھ یہ فن بھی رخصت ہوا اب کوئی سعادت علی خاں نہیں جو انشا، کے لطیفے سنے، کوئی بہادر شاہ ظفر نہیں جو مرزا کو ان کے حسن طلب کی داد دے وہ باغ و بہار شخصیتیں اب اس قدر عام نہیں کیوں کہ اب ان کے قدرداں نہیں یہ سب فراغت کی باتیں تھیں جو بادشاہت، جاگیرداری، زمیں داری کے ساتھ رخصت ہوئیں۔ ارباب نشاط کے ساتھ لطیفہ گو اور لطیفہ گوئی دونوں رخصت ہوئے۔ رنگیلے پیا اور ان کے جانشینوں کی سرپرستی زیادہ عرصہ قائم نہ رہ سکی۔ محمود و اکبر جیسے سرپرستوں کے ساتھ ساتھ فردوسی، سعدی، ابوالفضل اور بیربل جیسے ظریفوں کا دور بھی ختم ہوا وزیر اور ندیم کی جگہ مسخرے بھانڈ اور مفت خورے زیادہ دن نہ رہ سکے انھوں نے آتے ہی اس قدر دھول اڑائی کہ لطیفے کا دامن گرد و غبار سے اٹ گیا۔ اس کی آب اتر گئی، آپ سے "تم" اور "تم" سے "تو" تو تو میں میں اور اس کے بعد عضویاتی مظاہرے ہونے لگے۔ شیخ چلی کی جگہ شیخ سدو آئے۔ مگر امساک کھا کے انھوں نے منھ کا مزہ خراب کرا کے ہی دم لیا۔ لطیفہ دربار سے نکل کر بازار میں آیا۔ ضلع جگت اور پھبتیاں اس پر حاوی ہوگئیں۔ ان نوازشات کا یہ اثر ہوا کہ لطیفہ گوئی کا معیار گرنے لگا۔ علما، کی جگہ جہلا، نے سنبھال لی۔ اجنبی ہاتھ اسے سنبھال نہ سکے۔ ردِ عمل کے طور پر خواص و عوام کی ذہنی سطح پست ہونے لگی۔ اس کی روشنی میں اگر ہم دہلی اور لکھنؤ کی حکومتوں کا مطالعہ کریں تو ہم دیکھیں گے کہ معاشی اور سیاسی زوال نے اس تہذیبی زوال کو تیز تر کر دیا۔ دوسری دیسی ریاستیں بھی اس تاریخ کے بہاؤ سے اپنے آپ کو محفوظ نہ رکھ سکیں۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب، غیر ملکی عمل داری اور دیسی حکومتوں کے خاتمے نے اس کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی۔ لطیفہ گوئی کی روشنی میں دیکھنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کس عہد کا کیا مذاق تھا۔

بادشاہت کے ساتھ ساتھ لطیفہ گوئی کا بھی عہد رخصت ہوا۔ لطیفہ بازار سے دربار میں واپس نہ جا سکا اب تک عام انسان تاج و تخت سے علاحدہ کوئی خاص اہمیت نہ رکھتا تھا۔ لیکن اندرونی آزادی اور جمہوریت اپنے ساتھ آزادی کا پیغام لائی۔ مملوکیت رخصت ہوئی فرد کی اہمیت سماج میں بڑھ گئی انفرادی حیثیت سے پھلنے پھولنے کے مساوی حقوق نے شخصی آزادی کو سرسبز ہونے کا موقع دیا۔ شخصی آزادی کے ساتھ ادب وصحافت نے پھر سنبھالا لیا۔ جس کے دامن میں ظرافت نے پناہ لی۔ بہت جلد وطن عزیز پھر "اودھ پنچ" کے قہقہوں سے گونجنے لگا۔ اودھ پنچ لطائف کا سرچشمہ ہے اب ظریف اور داستان گو کی جگہ کتب و رسائل نے سنبھال لی۔ ملّا نصر الدین کو اردو والوں نے شیخ چلّی کے روپ میں پیش کیا۔ عربی دانوں کے پاس حافظ اور فارسی والوں کے پاس ملّا کا کردار تھا مگر اردو ادب کوئی نمایاں کردار نہ پیش کر سکا۔ شیخ چلی، ملّا جی، حافظ جی، پنڈت جی، لال بجھکڑ، شیخ جی، خاں صاحب، نواب صاحب، افیمچی، میاں جی کے پردے میں لطائف سماج کی خامیوں پر طنز ہوتے رہے۔ کچھ شخصیتیں بھی سامنے آئیں اور کچھ لطائف کتابی صورت میں سامنے آئے۔ عہدِ جدید کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ لطائف کتب و رسائل کی صورت میں محفوظ ہونے لگے۔

اردو ادب میں کلاسیکی لطائف کا ذخیرہ بہت کم ہے۔ بلکہ یوں سمجھیے کہ خس و خاشاک کا ایک پہاڑ ہے جس میں کہیں کہیں طنز و مزاح کی چنگاریاں دبی ہوئی ہیں ورنہ زیادہ تر ان لطائف کی آورد ثقالت و عریانیت مذاق سلیم پر بار گزرتی ہے ان میں "گل دستۂ پنج" "فتنہ" "خندۂ گل" "مذاق کا پٹارا" "ہنسی کا گول گپا" "دیوار قہقہہ" "لاحول" "شیطان" "بیربل" "ملا دوپیازہ" "شیخ چلی" "لطائف و ظرائف" "رنگ ظرافت" "غالب کے لطیفے" "آب حیات کے لطیفے" "نوادر چٹکیاں" اور گدگدیاں" "ادیبوں کے لطائف" "لطائف الشعراء" "اکبر کے لطیفے" "سیاہ حاشیے" "ملّا نصیر الدین کے لطیفے" اور "مجاز کے لطیفے" اردو ادب

www.taemeernews.com

کا ایک گل دستہ ہیں جس میں گُل بھی ہیں، گِل بھی ہیں۔ بیشتر لطائف آپ کے مذاق ومعیار پر پورے نہیں اترتے۔ ان مجموعوں کے ساتھ ایک لطیفہ یہ بھی ہے کہ عموماً بیشتر کتب میں تقریباً ایک ہی سے لطیفے معمولی ردو بدل کے ساتھ مل جاتے ہیں۔ وقت کی گردنے ان کا چہرہ ماند و مسخ کر دیا ہے۔ دفتر کے دفتر الٹنے پر بھی بسا اوقات ایک لطیفہ بھی ایسا نہیں ملتا جو علمی و ادبی معیار پر پورا اتر سکے۔ بعض کتب میں خال خال ایسے لطائف مل جاتے ہیں جو روح کو پھڑکا دیتے ہیں۔ ذہانت کو حرکت دیتے اور ہمارے لیے مسرت کا سامان مہیا کرتے ہیں۔

دورِ حاضر اردو لطائف کی تاریخ میں اس وجہ سے اہم ہے کہ اس میں اسے اپنا کھویا ہوا درجہ اور وقار رفتہ رفتہ واپس مل رہا ہے۔ اچھے ادبی انتخاب سامنے آرہے ہیں۔ ادبی رسائل، منتخب رسائل اور بچوں کے رسائل خاص طور پر اچھے اور معیاری لطائف کو زیادہ سے زیادہ اپنے دامن میں جگہ دے رہے ہیں۔

لطیفہ گوئی کی موجودہ صورت حال سے اس خیال کو تقویت ہوتی ہے کہ اس کا مستقبل خاصا واضح اور روشن ہے اس میں اصلاح اضافہ اور ترقی کے امکانات بہت صاف ہیں۔ اردو زبان کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس کی ترقی بھی فطری و لازمی ہے۔ زبان کے پھیلاؤ، گہرائی اور گیرائی کے ساتھ اس میں جو اضافے ہوئے ہیں ان کا معیار آئندہ اور بھی ستھرا اور بلند ہوگا۔

---

www.taemeernews.com

علیم صاحب

جس زمانے میں ہمارے پرانے دوست عابد سہیل یحییٰ گنج سے کٹڑہ ابو تراب جانے والی سڑک کے اس پار ایک منقش پھاٹک والے مکان میں رہتے تھے اور میں کرسچین کالج میں انٹر کا طالب علم تھا۔ ایک دن ان کے یہاں سے نکل رہا تھا کہ ایک تانگہ پھاٹک پر رکا۔ اس میں سے ایک نہایت وجیہہ، شکیل و بارعب صاحب اترے۔ ان کے ہونٹ میں سگار دبا ہوا تھا۔ اگر یہ کہوں کہ ان سرخ و سفید صاحب کا چہرہ کشمیری سیب یا قندھاری انار کی طرح سرخ تھا تو شاید تشبیہہ مکمل نہ ہو سکے گی۔ دونوں بھلوں سے وہ کہیں سرخ و تر و تازہ تھے۔ ساری سرخی کا مرکز ان کی ناک اور کان تھے۔ جو لال رنگ سے بھی زیادہ لال، بات بات پر ہو جاتے اور ان کے مزاجی "بیرومیٹر" کا کام دیتے۔ بہت خوبصورت شیروانی پائجامے میں تھے۔ چہرے پر فلسفیوں والا جلال و جمال، کیا چہرہ، کیا نگاہیں وہ سرتاپا غور و فکر میں غرق تھے۔ فرنچ کٹ داڑھی جس پر بائیں ہاتھ سے برش کر رہے تھے۔ داہنا ہاتھ جیبوں کی تلاش میں مصروف تھا کہ پیسے تانگے والے کو دینا تھے۔ پہلے ہم سمجھے کہ بول اس لیے نہیں رہے ہیں کہ منھ میں موٹا سا سگار فل اسٹاپ بنا ہوا ہے۔

عابد نے تقریباً دوڑتا ہوتے ہوئے انتہائی عقیدت سے خیریت دریافت کی تو معلوم ہوا کہ ان کے ماموں ہیں۔ یہ معلوم کرنے کی ضرورت نہ پڑی کہ یہ کون صاحب ہیں" اخباروں میں ان کی تصویر دیکھ چکے تھے تانگے سے جب وہ اتر رہے تھے تبھی ہم نے پہچان لیا تھا کہ یہ ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب ہیں۔

www.taemeernews.com

ہماری ادبی زندگی ابھی مشکل سے جمعہ جمعہ آٹھ دن کی تھی، کسی ادبی نشست یا کان فرنس میں ان کی زیارت کا شرف حاصل نہ ہو سکا تھا۔ تمام احباب عابد سہیل کو سب سے بڑا فلسفی سمجھتے وہ نہ صرف فلسفہ کے طالب علم تھے بلکہ بات چیت، نشست و برخاست، ہر اعتبار سے فلسفی معلوم ہوتے انھوں نے بھی علیم صاحب سے رشتہ داری کی ہوا تک نہ دی تھی۔ خیر یہ تو ان کے ظرف اور بڑائی کی بات ہوئی ورنہ اس وقت تو ہم یہی سمجھے تھے کہ یہ خطہ یونان ہے۔

صورتِ حال یوں تھی کہ عابد بہت سنبھل سنبھل کر، رک رک کر، ناپ اور تول کر اس طرح خیریت پوچھ اور بتا رہے تھے گویا فلسفے کا کوئی نیا نظریہ پیش کر رہے ہوں۔ علیم صاحب منھ چڑھے سگار کی پوزیشن بدل کے، داڑھی کھجا کے، آنکھیں بند کر کے اور مسکراہٹ کے ذریعہ ان کی باتوں کا جواب دے رہے تھے۔ ساری بات چیت ہاں، ہوں سے آگے نہ بڑھ سکی۔ وہ گھر کے اندر داخل ہوئے۔ ہماری اب گنجائش ذرا کم ہی تھی۔ ان کی پیٹھ دیکھتے ہی ہم آنکھوں ہی آنکھوں میں عابد کو گڈ بائی کر کے رفو چکر ہو گئے۔

علیم صاحب سے یہ پہلی ملاقات تھی جس میں تعارف کی تمام منزلیں یوں طے پائی تھیں کہ عابد صاحب نے تعارف کرایا۔ مارے رعب کے ہم دم بخود تھے انھوں نے سر کی جنبش، چہرے پر مشفقانہ مسکراہٹ سے جوابی کارروائی کی، بات چیت شدید خواہش کے باوجود نہ ہو سکی مگر اندر ہی اندر ہمارے ایک عجب پُر احترام مسرت کی لہر دوڑ گئی۔

ادیب ہونے کے لیے کچھ ضروری سا ہوتا ہے کہ آدمی دنیا دار کم اور بوہیمین زیادہ ہو۔ یہ سر پھرا پن ہمارے حصے میں بھی آیا تھا۔ چنانچہ چند ہی دنوں میں ادیبوں کے جرگوں، چائے خانوں، ہوٹلوں، کافی ہاؤس اور ادبی اجتماعات میں سرگرداں نظر آنے لگے۔

اس زمانے کا قاعدہ یہ تھا کہ چھوٹے بڑے سبھی شاعر، ادیب کافی ہاؤس میں جا کر جمتے۔ جہاں اس زمانے کی دو اہم ترین شخصیات کے گرد ادبی پروانے جمع ہوتے۔

ڈاکٹر عبدالعلیم اور پروفیسر ڈی پی مکرجی۔ کبھی کبھی میزیں مل جائیں۔ دونوں قطب یک جا ہو جاتے۔ مجاز، یشپال، پروفیسر احتشام حسین، ڈاکٹر قمر رئیس، ڈاکٹر محمد حسن، سلام، باقر مہدی، قاضی عبدالستار، عابد سہیل، شہاب جعفری، اقبال مجید، عثمان غنی، شوکت صدیقی، کمال احمد صدیقی، تجمل حسن، رضوان حسین، حسن عابد زیدی، رتن سنگھ، سبط اختر، آغا سہیل، احراز نقوی، انتصار حسین اور بہت سے دوسرے پرانی اور نئی نسل کے نمائندے۔

پاس آکے بیٹھنے کے بعد علمی مباحثے ہوتے، گرما گرمی ہوتی، آخر میں مقدمہ پرویز کونسل یعنی علیم صاحب کے سامنے پیش ہوتا۔ جسے وہ، بس ایک فقرے یا مسکراہٹ سے فیصل کر دیتے۔ وہ جج، صدر جلسہ اور شمع محفل کے فرائض کافی ہاؤس، ادبی جلسوں کان فرنسوں اور ادبی گھرانوں تک میں انجام دیتے۔ جس خاموشی اور وقار سے صدارت کرتے اتنی ہی جادو بیانی سے تمام بحث اور گرما گرمی کو چند جملوں میں سمیٹ لیتے۔ ایک ہی فقرے میں محفل زعفران زار ہو جاتی، دلوں کے گرد و غبار صاف ہو جاتے۔ وہ لکھنؤ کے مطلعِ ادب پر سورج کی طرح چمک رہے تھے۔ ادیب جہاں بھی ہوتے ان کے گرد ہوتے۔

علیم صاحب کی شخصیت عجب پرکشش تھی۔ وہ بیک وقت پر وقار و باغ و بہار تھے۔ سلام مچھلی شہری اور باقر مہدی ان کی جناب میں کچھ ضرورت سے زیادہ شوخ تھے۔ اس کے باوجود انھیں بے حد عزیز تھے۔

علیم صاحب خواہ لکھنؤ ریڈیو پر دنیا کا حال نشر کرنے جا رہے ہوں یا "نیا ادب" "انڈین لٹریچر" "ہندستان" یا "قومی آواز" کے دفاتر یا لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ عربی، درس و تدریس کے لیے آیا جا رہے ہوں اور تانگے پر نہ ہوں تو درجن بھر ادیب پیچھے پیچھے ہوتے۔ آگے وہ سنبھل سنبھل کر نہایت غور سے چلتے ہوئے نظر آتے۔

پھر ایسا ہوا کہ علیم صاحب شعبۂ عربی کے صدر ہو کر علی گڑھ چلے گئے جہاں اسلامک اسٹڈیز کے ڈائرکٹر ہوئے۔ حصولِ علم کا شوق مجھے علی گڑھ لے گیا۔ سر سید ہال کے

www.taemeernews.com

پھاٹک کے سامنے شمشاد مارکیٹ جانے والی سڑک پر روزانہ شام کو دیکھنے کہ علیم صاحب پروفیسر نورالحسن کے یہاں بدر باغ چلے جارہے ہیں۔ یا پروفیسر علیم کے یہاں پروفیسر نورالحسن چلے جارہے ہیں۔ کبھی بیچ راستے میں دونوں دوست ایک مسکراہٹ کے ساتھ مل جاتے۔ اور کسی کے یہاں روانہ ہوجاتے اکثر ان میں سے ایک اس طرح گھوم جاتا کہ دوسرے کی پیش قدمی میں فرق نہ آتا۔ ان کو آتا دیکھ کر ہم لوگ گھڑیاں ملا لیتے۔ کبھی کبھی رات کو دیکھتے کہ پروفیسر نورالحسن، پروفیسر علیم کو سہارا دے کر گھر پہنچانے جارہے ہیں اور کبھی پروفیسر علیم انھیں سنبھالے گھر چھوڑنے چلے جارہے ہیں۔

علی گڑھ میں قیام کے دوران ایک بار لکھنؤ سے لوٹا تو ایک مرحلہ یہ طے کرنا تھا کہ شوکت صدیقی کا ناول "خدا کی بستی" پروفیسر نورالحسن، پروفیسر حبیب اللہ، پروفیسر عبدالعلیم کو پیش کرنا تھا۔ "یونین" میں نورالحسن صاحب کی انتہائی شستہ انگریزی میں تقریر سن چکا تھا۔ اس لیے خائف تھا کہ انگریزی میں اگر وہ شروع ہوگئے تو کیا ہوگا۔ چپراسی کو پرچہ دیا۔ انھوں نے فوراً بلالیا۔ موصوف نہایت اخلاق سے ملے۔ یعنی اردو میں بات چیت کی۔ ان سے رخصت ہوکر پروفیسر حبیب کی خدمت میں حاضری دی۔ مل کر بڑی حیرت ہوئی کہ یا اللہ پروفیسر حبیب ایسے ہوا کرتے ہیں پڑھتے پڑھتے نہ صرف جسم تحلیل ہوچکا تھا بلکہ آواز تک گھس چکی تھی۔ ان کی انگریزی کسی افریقی زبان سے مشابہ تھی اور نرخرے سے برآمد ہورہی تھی۔ یہ اندازہ نہ کرسکا کہ وہ کتاب بھیجنے یا دینے والے سے خوش ہورہے ہیں یا ناراض۔؟ جواباً "پارڈن سر" عرض کرتا رہا۔ ان کے سامنے پروفیسر خلیق احمد نظامی بیٹھے ہوئے تھے۔ جن سے ملاقات تھی۔ انھوں نے مشکل آسان کرتے ہوئے بتایا "حبیب صاحب! شوکت صدیقی صاحب کی خیریت دریافت کررہے ہیں اور آپ کی زحمت کا شکریہ ادا کررہے ہیں۔!" مگر ہم اتنا گڑبڑا چکے تھے کہ پھر وہی "پارڈن" منہ سے نکل گیا۔ وہ ہنس پڑے اور میں جلدی سے باہر نکل آیا۔

www.taemeernews.com

علیم صاحب کے بنگلے میں ڈرتے ڈرتے داخل ہوا۔ برآمدے میں ان کے صاحبزادے حلیم مل گئے۔ انھوں نے فوراً اطلاع کر دی۔ علیم صاحب برآمد ہوئے آنکھوں ہی آنکھوں میں خوش آمدید کہا۔ کمرے میں بلایا، صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ دونوں ایک دوسرے کو تقریباً ۵ منٹ تک خاموشی سے دیکھتے رہے۔ اس دوران کئی بار ان کے دونوں کان اور ناک بالکل سرخ ہو گئے۔ غالباً کچھ کہنے کا ارادہ کر کے ملتوی کر دیتے تھے۔ آخر پہلو بدلا، داڑھی بھی کھجائی، سگار کو منھ ہی منھ میں گھمایا۔ ناک کان لال کر کے بولے

"کہیے ــــ!"

جواباً گڑبڑا کر کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے پلکوں کے اشارے سے بٹھا دیا۔

ہم نے عرض کیا۔

"شوکت صدیقی صاحب نے کراچی سے اپنا نیا ناول "خدا کی بستی" آپ کی خدمت میں بھیجا ہے ــــ"

انھوں نے جواباً ہاتھ بڑھا کر ناول لے لیا اور اسے گھورنے لگے۔

مزید عرض کیا۔ "نیازمند کو احمد جمال پاشا کہتے ہیں ــــ"

میرا نام سنتے ہی ان کی ناک شرم سے لال ہو گئی ــــ بولے

"واقف ہوں ــــ"

عرض کیا۔ "یہاں ایم اے میں ہوں۔ عابد سہیل صاحب کے یہاں اس سے پہلے آپ سے نیاز حاصل ہو چکے ہیں۔ پچھلے ہفتہ ذاکر صاحب کے یہاں سرور صاحب نے آپ سے ملوایا تھا۔" میری اس طویل تقریر کا ان پر کوئی اثر نہ ہوا کیوں کہ اس دوران ان کی ناک ایک بار بھی مزید لال نہ ہوئی۔

کافی آ گئی، میں کافی پیتا رہا وہ سگار چباتے رہے جب چلنے لگا تو انتہائی شفقت سے منھ سے بولے ــــ

"ملتے رہیے ــــ"

www.taemeernews.com

سلام عرض کر کے رخصت ہو گیا۔ علیم صاحب سے یہ میری دوسری ملاقات تھی۔ کچھ دن بعد ایک بہت ٹیڑھا کام پڑ گیا۔ ایک دوست جو آج کل فرانس میں ہیں ان کے داخلے کا سوال تھا۔ وہ پیسے سے بالکل ٹوٹے ہوئے تھے۔ بہت ہمت کر کے ان کو لے کر علیم صاحب کی خدمت میں حاضری دی۔ معاملہ کئی سو روپے کا تھا۔ وہ کسی چینی طالب علم سے چینی میں گفتگو کر رہے تھے۔ بڑی حیرت ہوئی کہ علیم صاحب چینی بھی جانتے ہیں۔ انھوں نے شاید پوری بات بھی نہیں سنی اور اندر چلے گئے۔ ذرا دیر میں واپس آ گئے ہاتھ میں ایک چیک تھا۔ جتنے روپے کی ضرورت تھی اس سے پچاس روپے زیادہ ہی تھے۔ ان صاحب کو چیک دیتے ہوئے کہا۔

"ضرورت ہو تو پھر چلے آیئے گا۔" اور چینی بولنے لگے اس وقت ان کے دونوں کانوں کی لویں اور ناک بالکل لال تھی۔

پھر علیم صاحب وائس چانسلر ہو گئے۔ ایک دن آنند نرائن ملا صاحب کو الوداع کہنے چار باغ گیا۔ ان کے برابر والی برتھ پر دیکھا تو علیم صاحب اپنا سگار درست کر رہے تھے۔ بڑی شفقت سے ملے۔ ملاقات کوئی ایک یا سوا گھنٹے کی تھی مگر وہ صرف پونے تین جملے بولے جس میں پون مجھ سے اور دو ملا صاحب سے۔

ان سے آخری ملاقات دہلی میں ہوئی وہ اردو بورڈ کے چیرمین تھے۔ بڑھاپا پورے طور پر آ چکا تھا۔ بیماریوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ دل کے عارضہ کی وجہ سے بورڈ کے دفتر میں نیچے ہی بیٹھتے تھے۔ اعصاب اس حد تک کمزور ہو چکے تھے کہ بات چیت تک کرنے لگے تھے۔ نہ صرف میری خیریت پوچھی بلکہ اپنی بیماری کی تفصیلات تک بتائیں اور بیشتر باتوں کا پورا جواب دیا۔

پھر ہم نے اچانک سنا کہ علیم صاحب بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔

علیم صاحب نے بہت کم لکھا، بہت کم بولے، بہت کم ملے جلے۔ مگر بہت زیادہ پڑھا۔ بہت زیادہ نیکیاں کیں۔ شاید اسی لیے وہ زیادہ سے زیادہ لکھنے والوں، طولانی اور طوفانی مقرروں پر ہمیشہ بھاری رہے۔ سربلند رہے۔ وہ لوگوں

سے نہیں ملے۔ مگر لوگ ان سے ملتے رہے۔ انھیں گھیرے رہے۔ انھیں جتنا بھی یاد کیا جائے کم ہوگا کیوں کہ وہ ایک عہد آفریں دور کی انتہائی شان دار شخصیت اور اردو ادب کے "مُغل اعظم" تھے۔